جمادی الاول ،جمادی الثانی
1428ھ 2007ء

خلافت میگزین

علیٰ منہاج نبوت

((...ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ))

''...پھر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت (نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت) قائم ہوگی'' (مسند احمد)

عدلیہ کا بحران

اصل سبب اسلام کا عدمِ نفاذ ہے

اسلام پولیس سٹیٹ کے انداز میں حکومت کرنے کو حرام قرار دیتا ہے

''کامیاب عورت'' کا مغربی اور اسلامی نقطہ نظر

افغانستان میں عدمِ استحکام کی اصل وجوہات اور اس کا درست حل

خلافت
میگزین
علیٰ منہاج نبوت

شمارہ نمبر 4
جمادی الاول ،جمادی الثانی
1428ھ 2007ء

فہرست

اداریہ ---------- 2

فقہی امور

درسِ قرآن الکریم ---------- 3
درسِ حدیث ---------- 4
سیرت کے اوراق سے ---------- 5

علاقائی امور

عدلیہ کا بحران اصل سبب اسلام کا عدمِ نفاذ ہے ---------- 8
افغانستان میں عدمِ استحکام کی اصل وجوہات اوراس کا درست حل ---------- 11
'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا اسلامی حکم اوراس کا صحیح دائرہ کار ---------- 14

خلافت اسپیشل

شرعی دلائل کی روشنی میں خلافت اور جمہوریت کا تقابلی جائزہ ---------- 17

فکری امور

اسلام پولیس سٹیٹ کے انداز میں حکومت کرنے کو حرام قرار دیتا ہے ---------- 23
''کامیاب عورت'' کا مغربی اور اسلامی نقطہ نظر ---------- 25

عالمی امور

عرب کانفرنس ---------- 29
خبرنامۂ مسلم ---------- 32
تصویری خبرنامہ ---------- 34

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حدیث نبوی ﷺ ہے:

''تمہارے اندر عہدِ نبوت موجود رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس کو ختم کردے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی جو(اس وقت تک) رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کردے گا۔ پھر موروثی حکومت کا دور ہو گا جو(اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر جابرانہ حکومت کا دور ہو گا جو(اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کردے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی۔''

(رواہ احمد)

زرِتعاون: فی شمارہ 10 روپے
Published by:
'Shabab-ul-Umma'
Publications Lahore Pakistan

حزب التحریر کی ویب سائٹس:
www.hizb-ut-tahrir.info
www.hizb-ut-tahrir.org
www.khilafah.com

رابطہ، مضامین بھیجنے اور میگزین منگوانے کے لیے
info.khilafat@yahoo.com
www.khilafat.pk

کشمیر اور فلسطین کے معاملے پر ہمارے حکمرانوں کا طرزِ عمل

25 اپریل 2007 کو دورہ سپین کے دوران جنرل مشرف کی طرف سے بیان جاری ہوا جس کے اندر مشرف نے کہا کہ ''ہم بھارت کے ساتھ جامع مذاکرات میں مصروف ہیں جن کا مقصد کشمیر سمیت تمام تنازعات کو حل کرنا ہے، اس مسئلے پر اہم پیشرفت ہوئی ہے'' نیز مشرف نے منموہن سنگھ کو قابل بھروسہ اور مردِ امن قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''مسئلہ کشمیر کا حل توقع سے پہلے بھی نکل سکتا ہے'' قبل ازیں وزیر خارجہ خورشید احمد قصوری نے یہ بیان جاری کیا تھا کہ ''مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلہ میں بات چیت مکمل ہو چکی ہے بس چند امور کو نبٹانا باقی ہے'' انہی دنوں پاکستان کے ایک نجی چینل 'جیو' پر انٹرویو دیتے ہوئے خورشید احمد قصوری نے یہ بات بھی دہرائی کہ بیک ڈور ڈپلومیسی کے ذریعے بھارت سے مسلسل بات چیت جاری ہے۔ جبکہ 20 اپریل کو عرب ٹی وی سے انٹرویو کے دوران جنرل مشرف نے کہا کہ ''مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے میری ثالثی قبول کر لی جائے اور اگر میرے دورے سے مسئلہ فلسطین حل ہونے میں مدد ملے تو میں اسرائیل جانے کو تیار ہوں'' ثالثی کے کردار اور دورے کی خواہش کے جواب میں اسرائیل کی وزارتِ خارجہ کے ترجمان مارک راگیو نے کہا کہ ''اسرائیل تنازع کے حل کے لیے پاکستانی پیشکش کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اس معاملے پر صدر مشرف کی کوششیں اور پیش رفت محدود رہنے کا امکان ہے''

پچھلی صدی کی پچاس کی دہائی میں استعماری کفار نے امت مسلمہ کے جسم پر دو کاری زخم لگائے تھے۔ ایک برصغیر کی تقسیم کے دوران 1947 میں مسلم اکثریتی علاقے کشمیر پر ہندو بنئے کے ہاتھوں ناجائز قبضہ اور دوسرا 1948 میں فلسطین کی مقدس سرزمین پر ناپاک یہودی وجود اسرائیل کا قیام۔ ایک ایسی سرزمین جس کی آزادی کے لیے سینکڑوں مسلمان اپنی جان قربان کر چکے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے یہ رِستے ہوئے زخم آج نصف صدی گزرنے کے باوجود بدستور موجود ہیں اور ان دونوں سرزمینوں پر کفار مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ کفار کا یہ وجود مسلمانوں کی سرزمینوں پر مسلط ایجنٹ حکمرانوں کے مرہونِ منت ہے جو کفار کے وجود کو ختم کرنے کے لیے اپنی فوجوں کو متحرک کرنے کی بجائے ان کے قبضہ کو برقرار رکھنے کے لیے دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔

آج پاکستان کے اندر پورے کا پورا سیاسی میڈیم عدلیہ کے مسئلہ پر الجھا ہوا ہے اور کسی کو اس بات کی فکر نہیں کہ حکمران اسلامی سرزمینوں سے متعلق کن غداریوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ بیک ڈور ڈپلومیسی کے نام پر ہمارے حکمران کشمیر کے کون سے حل کی بات کر رہے ہیں؟ جبکہ بھارت کے حکمران اور سیاسی پارٹیاں اس بات پر جمی ہوئی ہیں کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور وہ آزاد کشمیر کی واپسی کی بات کرتی ہیں۔ جیسا کہ 26 اپریل کو بھارت کی اپوزیشن پارٹی بی جے پی نے یہ بیان جاری کیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور مذاکرات آزاد کشمیر کی واپسی کے لیے ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے مشترکہ کنٹرول کے نام پر ہمارے حکمران صرف آزاد کشمیر ہی نہیں بلکہ شمالی علاقہ جات کو بھی بھارتی دائرہ اثر میں دینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ یہی وہ 'حل' ہے کہ جس کے قریب پہنچنے اور اس کے مکمل ہونے کی نوید حکمران پاکستان کی عوام کو سنا رہے ہیں اور وہ خود اس بات کو مان رہے ہیں کہ وہ اصل 'حل' جو ہونے والا ہے اس کا علم صرف چند شخصیات کو ہے جیسا کہ خورشید احمد قصوری نے فروری 2007 کے اوائل میں کہا تھا کہ ''کشمیر پر پیش رفت سے صرف چار پانچ لوگ معلومات رکھتے ہیں''

اسی طرح وہ اسرائیل جس نے فلسطین کی مقدس سرزمین پر قبضہ کیا اور وہاں کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بیدخل کیا۔ اور جو پچھلی نصف صدی سے مسلمانوں کو شہید کرنے پر لگا ہوا ہے، اس کے ناپاک وجود کو برقرار رکھنے کے لیے آج جنرل مشرف بے قرار ہے اور اسرائیلی لیڈروں کی قدم بوسی کے لیے اسرائیل جانے کے لیے بے چین ہے۔ اسرائیلی ریاست کا ایک ایک انچ مسلمانوں کی زمین ہے، جہاں سے مسلمانوں کو نکالا گیا ہے۔ اس بارے میں اللہ کا حکم بڑا واضح ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ﴾ ''اور جہاں تم ان کو پاؤ ان کو قتل کرو اور جس طرح انہوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی ان کو نکال دو'' (البقرہ:191)

ہمارے یہ ایجنٹ حکمران کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کو بکاؤ مال سمجھتے ہیں ان کے نزدیک مسلمان کے خون کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ یہ استعماری قوتوں کے غلام ہیں اور اسی غلامی کا حق ادا کرنے کے لیے مسلمانوں کو بیچنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الذّين قاتلوكم فى الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على اِخراجكم أن تَوَلَّوْهُمْ ومن يتولَّهُمْ فأولٰئك هم الظالمون﴾ ''جن لوگوں نے دین کی وجہ سے تمہارے ساتھ قتال کیا اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے دوستی کرنے سے تمہیں منع کرتا ہے جو لوگ ان سے دوستی کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔'' (الممتحنہ:9)

چنانچہ ان ظالم حکمرانوں اور ان کا تحفظ کرنے والے کفریہ سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے میں ہی ہماری نجات ہے۔

حکمرانوں کی اطاعت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اولوالامر (حکمرانوں) کی بھی'' (النساء:59)

مندرجہ بالا آیت کریمہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے علاوہ حکمرانوں کی اطاعت کے متعلق بھی ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت سے مراد تو قرآن اور سنت پر چلنا ہے لیکن حکمران کی اطاعت ایسا معاملہ ہے جسے تفصیلاً بیان کیا جانا چاہیے۔ اس آیت کے علاوہ کئی احادیث بھی ایسی ہیں کہ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حکمرانوں کی اطاعت کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ جیسا کہ بخاری نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا کہ انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((**من أطاعني فقد أطاع اللّٰه، و من عصاني فقد عصى اللّٰه، من أطاع أميري فقد أطاعني، و من عصى أميري فقد عصاني**)) ''جس نے میری اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی تو گویا اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی گویا اس نے میری نافرمانی کی''

اسی طرح بخاری نے ہی انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((**إسمعوا و أطيعوا و إن استُعمل عليكم عبد حبشي كأن رأسه زبيبة**)) ''سنو اور اطاعت کرو خواہ تم پر کالا حبشی مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح کا ہو'' یہ اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ حکمران کی اطاعت فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر، امیر یا امام کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ جو قرینہ اس حکم کے قطعی (یعنی فرض) ہونے پر دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امیر کی نافرمانی کو اپنی اور اللہ کی نافرمانی کی مانند قرار دیا۔ آپ ﷺ نے اطاعت کرنے پر زور دیا اگرچہ حکمران ایک کالا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ سب اس بات کے قرآئن ہیں کہ یہ حکم قطعی ہے لہٰذا حکمران کی اطاعت فرض ہے۔

ایک معاملہ جو حکمران کی اطاعت کے وجوب سے مستثنیٰ ہے وہ یہ ہے کہ جب حکمران معصیت کا حکم دے۔ نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((**على المرء المسلم السمع و الطاعة فيما أحبَّ و كره ، إلا أن يؤ مَر بمعصية ، فان أُمِرَ بمعصية فلا سمع و لا طاعة**)) ''ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سنے اور اطاعت کرے خواہ وہ اسے پسند کرتا ہو یا نہیں، سوائے جب اسے معصیت (گناہ) کا حکم دیا جائے۔ پس اسے اگر معصیت کا کام کرنے کا حکم دیا جائے تو وہ نہ تو سنے اور نہ ہی اطاعت کرے'' (مسلم)

یعنی اگر حکمران کسی مسلمان کو گناہ کا کوئی کام کرنے کا حکم دے نہ کہ حکمران بذاتِ خود کوئی معصیت کا کام سرانجام دے۔ کیونکہ اگر حکمران کسی کے سامنے گناہ کا کام سرانجام دے لیکن اس شخص کو ایسا کام کرنے کا حکم نہ دے تو اس شخص پر حکمران کی اطاعت کرتے رہنا پھر بھی واجب ہے۔ مسلم نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((**خيار أئمتكم الذين تحبونهم ويحبونكم ، وتصلون عليهم ويصلون عليكم، وشرار ائمتكم الذين تبغضونهم ويبغضونكم وتلعنونهم ويلعنونكم ، قالوا: قلنايارسول اللّٰه أفلا ننابذهم عند ذلك؟ قال: لا، ما أقاموا فيكم الصلاة، ألا مَن وَلِي عليه وال، فرآه يأتي شيئاً مِن معصية اللّٰه فليكره ما يأتي من معصية اللّٰه و لا يَنْزِعَنَّ يداً مِن طاعة**))

''تمہارے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ وہ تمہارے لیے دعائیں کریں اور تم ان کے لیے دعائیں کرو۔ اور تمہارے بدترین امام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان پر لعنتیں بھیجو اور وہ تم پر لعنتیں بھیجیں'' اس پر ہم نے کہا: ''کیا ہم ایسی صورت میں انہیں ہٹا نہ دیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم رکھیں۔ خبردار اگر کسی شخص پر حاکم مقرر کیا جائے اور وہ اس کی طرف سے اللہ کی معصیت کا ارتکاب دیکھے تو وہ اس اللہ کی معصیت کو ناپسند کرے مگر (حاکم کی) اطاعت سے ہاتھ مت کھینچے''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معصیت کا حکم دینے سے کیا مراد ہے۔ یعنی جب حکمران گناہ کا کام سرانجام دینے کا حکم دے نہ کہ وہ اسے خود سرانجام دے۔ اگر کوئی شخص حکمران کو گناہ کا کام کرتا ہوا دیکھے تو وہ اس کا محاسبہ تو کرے لیکن اس شخص کے لیے حکمران کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنا جائز نہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((**ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم، ولكن من رضي وتابع، قالوا أفلانقاتلهم؟ قال: لا، ماصلّوْا**))

بقیہ صفحہ نمبر 7 پر

اپنے گناہوں پر آہ وزاری کرنا

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((طوبی لمن ملک نفسه، وو سعه بیته، وبکی علی خطیئته)) ''اس پر رحمت ہو جو اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور جو اپنے گھر میں سما جائے اور اپنے گناہوں پر آہ وزاری کرے'' (یہ حدیث الطبرانی سے روایت ہے جنہوں نے اسے حسن قرار دیا)

مندرجہ بالا حدیث ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اللہ کی یاد اور اس کے خوف سے آنسو بہانا اور اپنے گناہوں پر آہ وزاری کرنا مندوب عمل ہے۔ اس بارے میں قرآن اور حدیث میں بارہا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کی نشانی بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعاً﴾

''اور وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور یہ قرآن ان کی عاجزی اور خشوع و خضوع بڑھا دیتا ہے'' (الاسراء:109)

مزید ایک اور جگہ فرمایا:

﴿إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا﴾ ''ان کے سامنے جب رحمٰن کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی تھی یہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے'' (مریم:58)

یہی وجہ تھی کہ امام الانبیاء، آقا دو جہاں حضرت محمد ﷺ کا معمول بھی یہی تھا جیسا کہ ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا: ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ'' میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں جبکہ یہ تو آپ پر نازل ہوا'' آپ نے فرمایا: ''میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میں کسی دوسرے سے قرآن کی تلاوت سنوں'' پس آپؓ نے آپ ﷺ کے سامنے سورۃ النساء تلاوت کی۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے ''بھلا اس دن کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ ﷺ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بس اتنا کافی ہے'' جب ابن مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (متفق علیہ)

صحابہ اکرام کا رویہ بھی یہی تھا کہ جب بھی آخرت کا ذکر آتا تو اللہ کے خوف سے آنسو بہاتے، جیسا کہ انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسا خطبہ دیا جیسا اس سے قبل میں نے کبھی نہیں سنا تھا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور زیادہ روؤ'' پس رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنے چہرے چھپا لیے اور وہ رو رہے تھے۔ (متفق علیہ) اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ابن عمرؓ نے روایت کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی تکلیف (یعنی بیماری) بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر سے کہو کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کرائیں'' عائشہؓ نے کہا: ''ابوبکرؓ بہت رقیق القلب ہیں اور وہ تلاوت کے دوران رونے پر قابو نہیں رکھ سکیں گے...''

یہ وہ عمل ہے جو اللہ کا نہایت پسندیدہ ہے۔ اللہ کو اپنے بندے کی عاجزی بہت پسند ہے اور ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم رکھا ہے، جیسا کہ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ کے خوف سے روتا ہے، اللہ اسے نارِ جہنم میں داخل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ دودھ واپس تھن میں داخل نہ ہو جائے اور اللہ اپنی راہ میں قتال کے دوران اڑنے والی گرد اور جہنم کے دھوئیں کو کبھی اکٹھا نہیں کرے گا'' (ترمذی)

اسی طرح ایک حدیث میں انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ کو یاد کرے اور اللہ کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو جب تک یہ آنسو زمین میں ہیں اس وقت تک اسے قیامت کے دن عذاب نہ ہوگا'' (الحاکم)

ایک اور حدیث میں ابو ریحانہ نے بیان کیا: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے نکلے اور میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اس آنکھ پر (دوزخ کی) آگ حرام کر دی گئی جو اللہ کے خوف سے روتی ہے، (اور) اس آنکھ پر (دوزخ کی) آگ حرام کر دی گئی جو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں جاگتی ہے اور میں تیسری بات بھول گیا لیکن بعد میں، میں نے سنا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اس آنکھ پر آگ حرام کر دی گئی جو ان چیزوں سے نگاہیں جھکا لیتی ہے جنہیں (دیکھنا) اللہ نے حرام کیا ہے'' (النسائی)

یہی وجہ تھی کہ مومنوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اعمال پر نظر رکھیں۔ اپنے آپ کو حرام کاموں سے دور رکھیں اور جو فرائض اللہ نے ان فرض کئے ہیں ان کی پابندی کریں لیکن انسان چونکہ خطا کا پتلا ہے اس لیے اپنے کئے گئے گناہوں پر اکرنے کی بجائے توبہ کرے اور اللہ کو یاد کر کے آنسو بہائے۔ یہ عاجزی ہی ہے جو کہ رب کو پسند ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ابن ابوملیکہ سے روایت ہے کہ ہم عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ حجر میں بیٹھے تھے کہ آپؓ نے بیان کیا: ''روؤ اور اگر رو نہیں سکتے تو یوں ظاہر کرو جیسے رو رہے ہو۔ اگر تم واقعی جان جاؤ تو تم سب نماز پڑھو یہاں تک کے تمہاری کمر ٹوٹ جائے اور تم روؤ یہاں کہ تمہاری آواز ختم ہو جائے'' (الحاکم)

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی سال

صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کی تربیت

اپنی دعوت کے ابتدائی دور میں آپ ﷺ نے لوگوں کی عمر، حیثیت، جنس، اصل اور نسل سے قطع نظر ہر اُس شخص کو دعوت دی جس میں آپ ﷺ نے اسے قبول کرنے کی استعداد دیکھی۔ آپ ﷺ لوگوں کو چن کر نہیں بلاتے تھے بلکہ ہر ایک کو دعوت دیتے اور اس شخص میں دعوت کی قبولیت کے آثار کو بھانپ لیتے تھے۔ اس طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ اِن لوگوں کی اسلامی تربیت بڑی فکرمندی سے کرتے اور اُنہیں قرآن کی تعلیم دیتے۔ پھر اِن صحابہ کا ایک حلقہ بنا دیتے تاکہ یہ خود دین کی دعوت آگے بڑھائیں۔ یہ تعداد چالیس کے قریب ہوگئی جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، اگرچہ زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ ان میں امیر، غریب، کمزور اور طاقتور سبھی شامل تھے۔

مومنین کی یہ جماعت جس نے اسلام کو قبول کیا اور دعوت کا کام کیا، ان افراد پر مشتمل تھی:

1) علی ابن ابی طالب (عمر 8 سال)
2) زبیر بن العوام (عمر 8 سال)
3) طلحہ ابن عبیداللہ (11 سال)
4) ارقم بن ابی الأرقم (عمر 12 سال)
5) عبداللہ ابن مسعود (عمر 14 سال)
6) سعید ابن زید (20 سال سے کم)
7) سعد ابن ابی وقاص (17 سال)
8) سعود ابن ربیعہ (17 سال)
9) جعفر ابن ابی طالب (18 سال)
10) صہیب الرومی (تقریباً 20 سال)
11) زید بن حارثہ (تقریباً 20 سال)
12) عثمان ابن عفان (تقریباً 20 سال)
13) طلیب بن عمیر (تقریباً 20 سال)
14) خباب بن الارت (تقریباً 20 سال)
15) عامر بن الفہیرۃ (تقریباً 23 سال)
16) مصعب بن عمیر (24 سال)
17) مقداد بن الأسود (24 سال)
18) عبداللہ بن جحش (25 سال)
19) عمر بن الخطاب (26 سال)
20) ابوعبیدہ بن الجراح (27 سال)
21) عتبہ بن غزوان (27 سال)
22) ابوحذیفہ بن عتبہ (30 سال)
23) بلال بن رباح (30 سال)
24) عیاش بن ربیعہ (30 سال)
25) عامر بن ربیعہ (تقریباً 30 سال)
26) نعیم ابن عبداللہ (30 سال)
27) عثمان ابن مظعون بن حبیب (30 سال)
28) حضرت عبد اللہ ابن مظعون بن حبیب (17 سال)
29) قدامہ ابن مظعون بن حبیب (19 سال)
30) السائب ابن مظعون بن حبیب (20 سال)
31) ابوسلمہ عبداللہ ابن الأسد المخزومی (تقریباً 30 سال)
32) عبدالرحمٰن ابن عوف (30 سال)
33) عمار بن یاسر (30 تا 40 سال کے درمیان)
34) ابوبکر الصدیق (37 سال)
35) حمزہ بن عبدالمطلب (42 سال)
36) عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ (50 سال)

اِن کے علاوہ عورتیں بھی تھیں جنہوں نے اسلام کی پکار پر لبیک کہا۔

تین سال کی اس محنت سے صحابہ کی یہ جماعت تیار ہوئی جس کا ہر فرد اپنی فکر و عمل کے لحاظ سے مکمل اسلامی شخصیت کا حامل تھا، ان میں سے ہر ایک فرد کے تصورات اسلامی تھے، وہ اپنی فکر و عمل کے لحاظ سے ایمان کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اب آپ ﷺ کی فکرمندی کم ہوئی اور آپ کو اطمینان ہوا کہ یہ جماعت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم آتے ہی قریش کے سامنے اپنے دین کی دعوت لے کر کھڑی ہو جائیگی۔

دعوت کی شروعات

اسلام کی دعوت کو لوگ اس دن سے جانتے تھے جس دن رسول اللہ ﷺ کو یہ پیغام ملا۔ مکّہ کے لوگ جانتے تھے کہ محمد ﷺ ایک نئے دین کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور کئی لوگ آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہو گئے ہیں۔ اہلِ مکہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ اپنے ساتھیوں کی تربیت کر رہے ہیں اور یہ بات بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مختلف حلقوں میں بٹ کر نئے دین کو سمجھ رہے ہیں اور اپنے اسلام قبول کرنے کی بات قریش پر ظاہر نہیں کر رہے ہیں۔

اہلِ مکہ اس نئے پیغام سے تو باخبر تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کس کس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور یہ لوگ کہاں جمع ہو کر دین سیکھتے ہیں۔ اس لئے جب آپ ﷺ نے باقاعدہ دین کی طرف بلایا تو یہ لوگوں کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اہلِ مکہ کو جس چیز نے چونکا دیا وہ مسلمانوں کا ایک نئی جماعت کی شکل میں اُبھر کر سامنے آنا تھا۔ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ان کے تین دن بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت مدد ملی اور پھر اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ . اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ . الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ج فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾

"پس تمہیں جس چیز کا حکم ملا ہے اسے واشگاف بیان کر دو اور مشرکین سے اعراض کرو۔ مذاق اڑانے والوں کیلئے ہم تمہاری طرف سے کافی ہیں، جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہراتے ہیں، پس عنقریب اُنہیں

معلوم ہو جائے گا'' (الحجر: 94)

اب اللہ کے حکم کے مطابق آپ ﷺ نے اس جماعت کو اہلِ مکہ کے سامنے ظاہر کیا۔ اس جماعت کو آپ ﷺ نے دو صفوں میں منظم کیا، ایک صف کی قیادت عمر بن الخطاب ؓ اور دوسری کی قیادت حمزہ ؓ نے کی۔ قریش نے کبھی ایسی صف بندی اور نظم دیکھا نہ تھا۔ آپ ﷺ انہیں لے کر کعبہ تشریف لائے اور سب نے کعبہ کا طواف کیا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب اسلام کھل کر سامنے آیا اور پہلا خفیہ دور ختم ہو گیا، جس میں دعوت صرف اُن لوگوں کو دی جاتی تھی جن سے پہچان تھی اور جن میں قبولیت کی استعداد پائی گئی تھی۔ اب وہ دور شروع ہوا جس میں لوگوں سے عام خطاب کیا گیا۔ اس طرح معاشرے میں ایمان اور کفر کے مابین ٹکراؤ کا آغاز ہوا اور صحیح اسلامی افکار اور فاسد کفریہ تصورات کے بین مقابلہ آرائی پیدا ہو گئی۔ یہاں سے دوسرے دور کا آغاز ہوا؛ تفاعل یعنی جدوجہد کا دور۔

اس دور میں مشرکینِ قریش نے دعوت کی مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ اکرام کو ایذا رسانی بھی کی۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کو مختلف طریقوں سے اذیتیں دی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ کے گھر پر پتھراؤ بھی ہوا، ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل آپ ﷺ کے گھر کے سامنے کچرا اور گندگی پھینک دیتی، آپ ﷺ نے ان سب کو نظر انداز کیا۔ ابوجہل نے ایک دفعہ اپنے بتوں پر قربان کی گئی بھیڑ کی آنتیں آپ ﷺ پر ڈال دیں، آپ ﷺ نے اسے برداشت کیا، آپ فاطمہؓ کے گھر گئے اور خود کو اس نجاست سے پاک کیا۔ اس سے آپ ﷺ مایوس ہونے کے بجائے اپنے ارادے اور دعوت میں اور مضبوط ہوتے تھے۔

قریش کا ہر قبیلہ مسلمانوں کو دھمکاتا اور ایذائیں پہنچاتا، تاکہ اس قبیلے میں جو کوئی اسلام کی دعوت کو مان چکا ہو وہ اس سے پھر جائے۔ ایک دفعہ، ایک شخص نے اپنے غلام بلال ؓ کو گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر بھاری پتھر صرف اس وجہ سے رکھا کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ بلال ؓ اس حالت میں بھی صرف ''اَحد اَحد'' (ایک ہے، ہاں اللہ ایک ہے) کہتے رہے اور اس تمام تر تکلیف کو اللہ کی خاطر برداشت کیا۔ ایک مسلم خاتون کو اتنی اذیتیں دیں کہ وہ تاب نہ لا سکیں اور شہید ہو گئیں لیکن انہوں نے اسلام کا دامن چھوڑ کر اپنے باپ دادا کے دین کو نہ اپنایا۔

مسلمانوں نے ہر قسم کی مصیبتیں، اذیتیں، ذلتیں اور محرومیاں برداشت کیں، ان تمام تکالیف کو برداشت کا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دعوتِ اسلام کی مخالفت

جب رسول اللہ ﷺ دینِ اسلام کی دعوت کے ساتھ مبعوث ہوئے تو لوگوں نے آپ ﷺ اور ان کے پیغام کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ اور قریش نے اس صورتِ حال کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ عام دانشوروں کی گفتگو کی طرح یہ دعوت بھی اپنا اثر خود کھو دیگی اور لوگ دوبارہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئینگے۔

اسی وجہ سے وہ ایک مدت تک اس دعوت کو نظر انداز کرتے رہے بلکہ جب آپ ﷺ قریش کی مجالس کے قریب سے گزرتے تو یہ لوگ کہتے ''وہ دیکھو وہ عبدالمطلب کا بیٹا جا رہا ہے جس کے ساتھ آسمانوں سے بات ہوتی ہے''۔ لیکن کچھ عرصے بعد جب قریش نے اس دعوت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے مخالفت کی ٹھان لی۔ ابتداء میں تو یہ مخالفت رسالت کے دعوے کی تضحیک و تذلیل تک محدود رہی، لیکن پھر انہوں نے آپ ﷺ کو چیلنج کیا کہ اگر آپ ﷺ سچے ہیں تو اپنے دعوے کی تصدیق کیلئے کوئی معجزہ دکھائیں۔ وہ کہتے کہ یہ صفاء اور مروہ کی پہاڑیوں کو سونے میں کیوں تبدیل نہیں کر دیتے؟ جو کتاب اِن پر نازل ہوئی ہے وہ آسمان سے لکھی ہوئی صورت میں کیوں نہیں اترتی؟ جبریلؑ جن کی یہ بات کرتے ہیں، وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟ یہ مردوں کو زندہ کیوں نہیں کرتے؟ مکّہ کے اطراف سے پہاڑوں کو ہٹا کیوں نہیں دیتے؟ یہ جانتے ہیں کہ ہمیں پانی کی کتنی قلت رہتی ہے تو پھر یہ زمزم کی طرح پانی کا کنواں کیوں نہیں کھودتے؟ انہیں اللہ اشیاء کی مستقبل کی قیمتیں کیوں نہیں بتاتا، تاکہ ہم بھی اس خبر سے کوئی فائدہ حاصل کر سکیں؟

اس طرح قریش آپ ﷺ کی اور اسلام کی دعوت کا مذاق اُڑایا کرتے، کبھی ہتک آمیز باتوں سے، کبھی توہین سے اور کبھی طنز سے۔ لیکن آپ ﷺ اپنے مقصد سے ذرا بھی نہیں ڈگمگائے اور لوگوں کو اپنی دعوت دینے پر استقامت سے ڈٹے رہے۔ آپ ﷺ بتوں کی عبادت کرنے والوں کو سوچنے کی دعوت دیتے اور سمجھاتے کہ یہ سطحی سوچ کی علامت ہے کہ ان بتوں کی عبادت کی جائے اور ان سے امیدیں باندھی جائیں۔

اب یہ قریش کی قوتِ برداشت سے باہر ہو رہا تھا، اُنہوں نے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا، کہ آپ ﷺ کو اس دعوت سے باز رکھا جائے، لیکن بے سود۔ قریش نے دعوت کی اس مخالفت میں جو حربے استعمال کیے وہ یہ تھے:

1) تشدد
2) اندرونی و بیرونی طور پر دعوت کے خلاف پراپیگنڈہ
3) بائیکاٹ

رسول اللہ ﷺ کو اپنے خاندان اور صحابہ کرام ؓ کی حفاظت کے باوجود تشدد جھیلنا پڑا۔ آلِ یاسر کو صرف اسلئے تشدد جھیلنا پڑا کہ وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئیں۔ لیکن ان مصائب نے ان کے ایمان اور ثابت قدمی میں مزید اضافہ کیا۔ ایک بار جب آپ ﷺ آلِ یاسر کے محلے سے گزرے تو ان پر تشدد کیا جا رہا تھا، آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا:

((صَبْرَاً آل يَاسر فَإِنَّ مَوْعِدُكُمْ الجَنَّة إِنِّي لاَ أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللهِ شَيئاً))

''اے آلِ یاسر صبر کرو تمہارا بدلہ جنت ہے اور تمہارا مقدر اللہ کے پاس ہے''

اس پر سمیہؓ نے فرمایا:

(إِنِّي أَرَاهَا ظَاهِرَة يَا رَسُول الله)

''اے اللہ کے رسول ﷺ میں (جنت) دیکھ رہی ہوں''

اس طرح قریش آپ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ پر

تشدد کرتے رہے جب تک کہ انہیں یہ احساس نہ ہو گیا کہ اب محض جسمانی ایذائیں کافی نہیں ہیں اور اس دعوت کو روکنے کیلئے کسی اور حربے کا سہارا لینا پڑیگا۔ اب قریش نے باقاعدہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا جس میں آپ ﷺ کی دعوت اور خود آپ ﷺ کی ذات کو توہین کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ پروپیگنڈہ مکہ کے علاوہ بیرونی علاقوں میں بھی کیا گیا، جیسا کہ حبشہ میں۔ اس میں بحث وتکرار، دعوت کی تضحیک اور الزام تراشی جیسے حربے شامل تھے۔ یہ الزام تراشی اسلامی عقیدے اور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک پر کی گئی، اور اس میں جھوٹ کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مختلف طریقوں سے اسلامی دعوت اور آپ ﷺ کو غیر معتبر ظاہر کرنے کی سازشیں کی گئیں۔

یہ الزام تراشی ایک سوچے سمجھے طریقے سے خاص طور پر حج کے موسم میں کی جاتی۔ اس حد تک کہ ولید بن مغیرہ کے ساتھ گفتگو کر کے ایسے طریقے نکالے جاتے کہ یہ الزام تراشی زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو۔ بڑے سوچ بچار سے ایسی باتیں گھڑی جاتیں جو حج کے دوران عربوں سے کہی جائیں تا کہ حج کے دوران مکہ میں باہر سے آنے والے عرب اس دعوت سے مرعوب ہونے کی بجائے بدظن ہوں۔ کئی لوگوں نے مشورہ دیا کہ محمد ﷺ کے متعلق کہا جائے کہ وہ کاہن ہیں، اس پر ولید ابن مغیرہ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں، اسلئے کہ محمد ﷺ نہ تو کاہنوں کی طرح بڑبڑاتے ہیں اور نہ اُنکی باتیں کاہنوں کی سی ہیں۔ ولید نے یہ مشورہ رد کر دیا۔ کچھ نے کہا کہ محمد ﷺ کو دیوانہ قرار دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ ان پر جنوں کا اثر ہے۔ ولید نے اس مشورے کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ محمد ﷺ سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی بنا پر اس الزام کو موزوں سمجھا جائے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ ﷺ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگائی جائے، تو ولید نے اسے بھی رد کر دیا کیونکہ آپ ﷺ کے کلام میں یا اُن کے عمل میں ایسی کوئی بات نہیں جسے لوگ جادو ماننے کو تیار ہوں۔

اس طرح کی لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو لفظوں کا جادوگر (ساحر البیان) بتایا جائے۔ پھر یہ لوگ پھیل گئے اور اہل عرب سے یہ بات کہی کہ محمد ﷺ کی بات نہ سنو کیونکہ اُنکے کلام میں جادو ہے، وہ اپنی باتوں سے لوگوں میں تفرقہ ڈال کر بھائی کو بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بہن سے جدا کر دیتے ہیں اور جو کوئی اُنکی بات سنے گا تو وہ اُن کے اثر میں آ کر اپنے خاندان سے علیحدہ ہو جائیگا۔ بہرحال اس قسم کی تہمتیں اور سازشیں بھی اسلام کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے سے نہ روک سکیں۔ اب قریش نے نضر بن الحارث کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف اس پروپگنڈے کا محاذ سنبھالے۔ نضر کا طریقِ کار یہ ہوتا کہ جب کبھی آپ ﷺ کسی مجلس کو مخاطب کرتے اور پچھلی قوموں پر ہونے والے اللہ کے عذاب کی بات بتاتے، تو وہ تاک میں رہتا اور جیسے ہی آپ کی بات ختم ہوتی اور آپ روانہ ہوتے تو وہ ان لوگوں کو مخاطب کرتا اور اُنہیں فارسیوں کے پچھلے قصّے اور اُنکے مذہب کے بارے میں کہانیاں سنانے لگتا اور کہتا: ''کیا محمد ﷺ مجھ سے بہتر کہانیاں سناتے ہیں؟ کیا محمد ﷺ کی طرح میں بھی پرانے قصے نہیں سناتا؟''

یوں کفارِ مکہ کوشش میں سرگرداں رہے کہ لوگ آپ اور آپ کے ساتھیوں سے متنفر ہو جائیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 3 سے

درسِ قرآن الکریم

''ایسے امیر ہوں گے جن کے (بعض کاموں کو) تم معروف پاؤ گے اور (بعض کو) منکر۔ تو جس نے پہچان لیا وہ بری ہوا اور جس نے انکار کیا وہ (گناہ سے) محفوظ رہا۔ لیکن جو راضی رہا اور تابعداری کی (وہ بَری ہوا نہ محفوظ رہا)۔ پوچھا گیا: ''یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم انہیں تلوار کے ذریعے باہر نہ نکال پھینکیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں''

لیکن اگر حکمران کسی شخص کو کوئی ایسا حکم دے جس کے کرنے میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو تو حکمران کے حکم کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اُس معاملے میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں جو خالق کی نافرمانی پر مبنی ہو۔

یہ وہ واحد صورتِ حال ہے جو کہ حکمران کی اطاعت سے مستثنیٰ ہے یعنی جب وہ معصیت کا حکم دے اور اس امر کے معصیت پر مبنی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر حکمران سود لینے کا حکم دے۔ تاہم اگر وہ کسی ایسے کام کا حکم دے جو اس کی رائے میں حلال ہو لیکن دیگر لوگ اسے حرام تصور کرتے ہوں تو ایسی صورتِ حال میں اس کی اطاعت واجب ہے اور اس کی حکم عدولی کرنا حرام ہے۔ اس بات کو معصیت کا حکم دینا تصور نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ایک حلال کام کے کرنے کا حکم ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص فوٹو گرافک پکچر کھینچنے کو حرام سمجھتا ہو جبکہ حکمران کی رائے یہ ہو کہ یہ ایک حلال فعل ہے اور وہ سرکاری معاملات کے لیے اس شخص کو تصویر بنوانے کا حکم دے تو اس شخص کے لیے اس حکم کی اطاعت کرنا واجب ہے اور یہ معصیت کو حلال بنانا نہیں۔ کیونکہ اس معاملے میں حکمران کے نزدیک ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث مصوری کے بارے میں ہے، جو تصویر بنانے کی ممانعت بیان کرتی ہے اور اس کا اطلاق فوٹو گرافک پکچرز پر نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ حکمران کے مطابق دلیل یا شبہۃ دلیل ہے۔ لہٰذا حکمران کا سرکاری معاملات یا دستاویزات کے لیے فوٹو گرافک تصاویر کے استعمال کا حکم معصیت کا کام کرنے کا حکم نہیں لہٰذا اس کی اطاعت واجب ہے اور اس معاملے میں اس کی حکم عدولی کرنا جائز نہیں۔

موجودہ حالات میں مسلم سرزمینوں پر مسلط حکمران نا صرف مسلمانوں کو معصیت کا حکم دیتے ہیں بلکہ جن نظاموں کے تحت وہ حکمرانی کر رہے ہیں وہ نظام ہی کفریہ ہیں۔ ان کا معاملہ اسلام کے تحت حکمرانی کرنے والے خلفاء جیسا نہیں ہے بلکہ ان حکمرانوں اور مسلط کیے گئے نظاموں کو اکھاڑ پھینکنے کا حکم ہے۔

عدلیہ کا بحران - اصل سبب اسلام کا عدم نفاذ ہے

نوید بٹ
navid.butt@yahoo.com

انسان جب بھی اپنے آپ کو عقلِ کل تصور کرتا ہے یا خود کو اللہ سے زیادہ ذہین اور فطین سمجھتا ہے تو لامحالہ منہ کی کھاتا ہے۔ مغرب کا زوال پذیر ہوتا سرمایہ دارانہ نظام اس کی ایک روشن دلیل ہے۔ آج امریکہ میں لاکھوں لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آزادی کا پروردہ معاشرہ single parents (بن باپ یا بن ماں) کی وباء کا شکار ہے جس کی وجہ سے ان کی نئی نسل منشیات اور گینگز میں آسودگی تلاش کرتی نظر آتی ہے۔ ہر طرف اللہ کے قوانین کے خلاف بغاوت کرنے والے بتدریج اپنے کیفر کردار تک پہنچ رہے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ بھی مغرب کی اندھی تقلید میں اسی طرف رواں دواں ہے۔ گو کہ ہمارے معاشرے میں آج بھی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اپنی مرضی سے اپنے ذاتی اور انفرادی تعلقات میں اسلام کی اتباع کر رہی ہے لیکن دیگر معاملات میں ان پر انگریز کا چھوڑا ہوا کفر نظام ہی نافذ ہے۔ چنانچہ ہمارا خاندانی ڈھانچہ (family system) آج بھی کسی قدر اسلامی ہے، جہاں ہم ماں، باپ، بھائی، بہن، قریبی رشتہ دار وغیرہ کے ساتھ تعلقات میں اسلام کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی معاشرے میں آزادی کے نام پر ایک بہن اپنے بھائی کو اپنے بوائے فرینڈ سے متعارف کرانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ لیکن جہاں تک معاشرے کے اجتماعی معاملات کی تنظیم کا تعلق ہے تو اس کے لئے جو نظام نافذ ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ حکومت سودی لین دین کو حلال قرار دیتی ہے۔ نیوائیر نائٹ ہو یا بسنت کا تہوار اسے قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ عوامی کنسرٹس ہوں یا سرکاری ایلیٹ مجرے سب کے سب موجودہ قانون کی زد سے محفوظ ہیں۔ اسی طرح افغانستان میں امریکی افواج کو انڈے اور گوشت پہنچانے کا عمل ہو یا مسلمانوں کے جسموں کا قیمہ کرنے والے ہیل فائر اور ڈیزی کٹر بموں کی ترسیل کا، دونوں کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ نیز یاد رہے کہ آئین کی سترھویں ترمیم کے بعد کوئی شہری اس ''لاجسٹک سپورٹ'' کو کسی بھی عدالت میں چیلنج بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے غیر شرعی یا اگر میں کھل کر کہوں تو کافرانہ نظام جس کے نفاذ کے ثمرات اور پھل آج ہم کاٹ رہے ہیں۔ حال ہی میں پیدا ہونے والا عدالتی بحران بھی اسی کفریہ نظام کا ایک خبیث پھل ہے۔ 12 مئی 2007 کو کراچی کے اندر درجنوں افراد اس بحران کا شکار ہو گئے، سینکڑوں زخمی ہوئے اور کروڑوں کی گاڑیاں نظرِ آتش کر دی گئیں۔ یہ بحران چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف جنرل مشرف کی طرف سے ریفرنس دائر کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیں کہ وہ آئینی شق جس کو بنیاد بنا کر صدر صاحب نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس دائر کیا، کس حد تک اسلامی ہے۔ نیز اگر عدلیہ سے متعلق اسلامی نظام نافذ ہوتا تو کیا اس طرح کے بحران پیدا ہونے کی کوئی گنجائش تھی؟

پاکستان کا آئین غیر اسلامی شقوں سے بھرا پڑا ہے۔ آرٹیکل 209 جس کے تحت جنرل مشرف نے چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس جاری کیا ہے دیگر آئین کی شقوں کی طرح غیر اسلامی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہم نے انگریز کے چھوڑے عدالتی نظام اور پینل کوڈ کو محض چند کاسمیٹک تبدیلیوں کے ساتھ من وعن قبول کر لیا تھا۔ یہی معاملہ حکومتی نظام کا ہے جس میں چند شرائط کا اضافہ تو کیا گیا لیکن عوامی نمائندوں کی اکثریت ہی کو قانون سازی کا حتمی سرچشمہ قرار دیا گیا۔ اسی کی بنیاد پر حال ہی میں حدود آرڈیننس میں تبدیلی کی گئی۔ اور اسی وجہ سے سود جیسے صریح کفریہ قوانین تا حال برقرار ہیں کیونکہ اس اکثریت نے ان قوانین کو کالعدم قرار نہیں دیا گو کہ شریعت اسے چودہ سو سال قبل حرام قرار دے چکی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ موجودہ نظام اللہ کے دیئے گئے قوانین کو بالائے طاق رکھ کر انسان کی ذہنی اختراع کو قوانین کی بنیاد اور منبع بناتا ہے۔ حالیہ آئینی بحران کی وجہ بھی یہی نظام اور آئین ہے جو ایسے قوانین دیتا ہے جو انسانوں کے مسائل کو سلجھانے کی بجائے انہیں مزید

الجھا دیتے ہیں۔ آج اگر عدلیہ سے متعلق اسلامی قوانین نافذ ہوتے تو عوام کو اتنے بڑے بحران کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

موجودہ آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت ایک عام آدمی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج حضرات کا ازخود محاسبہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی انہیں کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرسکتا ہے۔ وہ ان کے خلاف کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کے لئے چیف جسٹس یا صدر کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اس جج کے خلاف ریفرنس سپریم جوڈیشل کونسل کو بھیجنے یا نہ بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اپنے خلاف ریفرنس آنے کے بعد چیف جسٹس صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کے پاس اس سے پیشتر دیگر دو ججوں کے خلاف بھی شکایات آچکی تھیں جنہیں انہوں نے ابھی تک سپریم جوڈیشل کونسل کو نہیں بھجوایا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ نظام دیگر حکومتی اہلکاروں کے مقابلے میں ان جج حضرات کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتا ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں ملتی۔ یہ استثنائی طریقہ کار ہی انصاف تک رسائی میں عوام کے لئے ایک بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اسلام میں کوئی مقدس گائے نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی شخص قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ خلافت میں رائج اسلام کے عدالتی نظام میں جج حضرات کے محاسبے کا عمل بڑا سادا، تیز تر اور شفاف ہوتا ہے۔ اسلام کے تحت حکمران، جج اور حکومتی اہلکار تمام کے لئے محاسبہ کا ایک ہی طریقہ کار ہے۔ کسی بھی شہری کو جج کا محاسبہ کرنے اور اس کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے لئے حکمران یا چیف جسٹس کے ریفرنس یا اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ شخص کسی بھی ''قاضی مظالم'' کے پاس جا کر کسی دوسرے جج، حکومتی اہلکار یا حکمران کے خلاف مقدمہ دائر کر کے انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ یوں حکمرانوں کا اس مسئلے میں فریق بننے کا بھی کوئی امکان نہیں ہوتا جیسا کہ موجودہ بحران میں ہو گیا ہے۔ عوام کے غم و غصے کی بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ چیف جسٹس کے معاملے میں صدر مملکت فریق بنے ہوئے ہیں اور وہ اسے عدلیہ اور ایوان صدر کی جنگ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن اگر اسلامی قوانین نافذ ہوتے تو عوام خود کسی بھی قاضی مظالم کے پاس جا کر چیف جسٹس کا محاسبہ کر سکتے تھے اور اس صورت میں کسی کو بھی اعتراض ہوتا نہ ہی عدلیہ کا وقار مجروح ہوتا۔

جہاں تک خفیہ عدالتی کارروائی (in-camera proceedings) کا تعلق ہے تو یہ بھی اسلامی عدالتی قوانین کے برخلاف ہے کیونکہ اختیارات کے ناجائز استعمال یا کرپشن وغیرہ کے معاملات کی سماعت کھلی کچہری میں ہوتی ہے جس تک عوام اور میڈیا کو مکمل رسائی حاصل ہوتی ہے۔ جس کی بدولت نہ صرف فریقین کے ساتھ زیادتی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں بلکہ عوام میں بھی بدظنی نہیں پھیلتی۔ موجودہ بحران میں عوامی اضطراب کی ایک بڑی وجہ خفیہ عدالتی کارروائی ہے جس کو میڈیا یا سپریم جوڈیشل کونسل کی مرضی کے بغیر رپورٹ نہیں کرسکتا۔ اور چونکہ عوام پہلے ہی حکمرانوں پر بھروسہ نہیں کرتے اس لئے وہ اس پس پردہ تحقیقات کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس نظام کا ایک اور بودہ پن یہ بھی ہے کہ سپریم جوڈیشل کونسل عدالت کی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ ہی ان کے فیصلے کی اتباع کرنا صدر صاحب پر واجب ہے۔ اس سے بڑھ کر عدالتی کارروائی کا اور کیا مذاق ہوسکتا ہے کہ معاملات کا فیصلہ کرنے والے ادارے کے پاس فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات ہی نہیں۔ اسلام میں عدالتیں مکمل طور پر بااختیار ہوتی ہیں یہاں تک کہ خلیفہ بھی ان کے فیصلے کو تبدیل نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی اور عدالت ان کے فیصلے کو محض اپنی مرضی کے بنیاد پر کالعدم قرار دے سکتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں کوئی چھوٹی یا بڑی عدالت نہیں ہوتی۔ ہر عدالت کا فیصلہ سپریم کورٹ کے فیصلے کی طرح حتمی اور آخری ہوتا ہے اور اس کے فیصلے کی کوئی دوسری عدالت توہین نہیں کرسکتی۔ یوں شہریوں کو سالہا سال کبھی ایک عدالت سے دوسری عدالت کے دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ یوں ایک عام شخص کو پہلی ہی عدالت میں انصاف مل جاتا ہے اور مجرم کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ پکڑا گیا تو اسے فوراً سزا کا سامنا کرنا پڑیگا۔

اس نظام کا ایک اور امتیازی سلوک جو ماضی میں دیکھنے کو ملا ہے وہ یہ ہے کہ اگر جج اپنے خلاف ریفرنس سننے کی بجائے مستعفی ہو جائے تو اس کے خلاف ریفرنس داخل نہیں کیا جاتا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر جج اپنے عہدے سے دستبردار ہو جائے تو تمام تر سیاہ کو سفید تسلیم کر لیا جائے؟ کیا یہی معاملہ دیگر تمام حکومتی عہدوں کا ہے؟ کیا عوام کو بھی اس قسم کی ''سہولت'' میسر ہے؟ یہ ہے انسان کا بنایا ہوا قانون جو کبھی بھی تمام انسانوں کو انصاف مہیا نہیں کرسکتا۔ اسلام میں اس طرح کا کوئی استثنائی قانون نہیں ہے اور تمام لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں۔

مزید برآں آئین کے آرٹیکل 209 کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل اپنا فیصلہ ججوں کی اکثریتی رائے کے مطابق کرتی ہے۔ جبکہ اسلام کے عدالتی نظام میں فیصلے اکثریت کی بنیاد پر نہیں ہوتے۔ ہر عدالت میں فیصلے کا حق محض ایک جج کے پاس ہوتا ہے جو دیگر ججوں سے مشورہ تو کرسکتا ہے لیکن فیصلے کا ذمہ دار وہ اکیلا ہی ہوتا ہے کیونکہ سنت نبوی اور اجماع الصحابہؓ سے صرف اسی طریقہ کار کی دلیل ملتی ہے۔ یوں اس ضمن میں بھی آئین کا یہ آرٹیکل اسلامی عدالتی نظام سے متصادم ہے۔

اسلام کا عدالتی نظام جج کو حکمران کے دباؤ سے آزاد کرتا ہے۔ اسلام کے تحت اگر کسی حکمران کے خلاف کسی بھی قسم کا کیس قاضی مظالم کے زیرغور ہے تو پھر کیس کے اختتام تک خلیفہ اس قاضی کو معزول نہیں کر سکتا۔ جبکہ قاضی کے پاس قوانین کے تحت کسی جرم کے ارتکاب کی صورت میں خلیفہ کو معزول کرنے یا اسے سزا دینے کا اختیار ہوتا ہے۔

پاکستان کے قوانین کے مطابق ایک شخص کے خلاف FIR کٹ جائے تو اس ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوا دیا جاتا ہے اور اگر اس کے پاس ضمانت کروانے کے وسائل نہ ہوں تو وہ سالہا سال جیل میں سڑتا رہتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ ایک سچی ایف آئی آر تھی یا جھوٹی۔ چیف جسٹس کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا سلوک روا رکھا گیا جبکہ ابھی تک ان پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس اسلام میں ایک ملزم کو محض شک کی بنا پر جیل نہیں بھجوایا جاتا۔ چنانچہ چیف جسٹس کے ساتھ ہونے والی زیادتی بھی درحقیقت اسی

ذہنی کیفیت (mindset) کا نتیجہ ہے جہاں ایک ملزم تقریباً ایک مجرم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ناروا سلوک رکھنا کوئی خاص بری بات نہیں ہوتی۔ اب چیف جسٹس صاحب کو بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جن کفر قوانین کو وہ عوام الناس پر لاگو کرتے رہے ہیں وہ کس قدر ظالمانہ اور جابرانہ ہیں!

رانا بھگوان داس کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہونے سے نظام کے اسلامی ہونے کا رہا سہا شائبہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ کسی بھی نظریاتی ریاست میں اس نظریے سے انکار کرنے والے کبھی بھی اس نظام کو چلانے اور اسے نافذ کرنے والے نہیں ہو سکتے۔ اگر پاکستان واقعی ایک نظریاتی اسلامی ریاست ہے تو پھر اس میں حکمران اور جج کبھی بھی اس نظریے کی اساس کو مسترد کرنے والے نہیں بن سکتے۔ آج اگر ایک ہندو عربی کی چند آیات رٹ لے اور نکاح کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لے پھر بھی وہ کسی مسلمان کا نکاح نہیں پڑھا سکتا۔ اسی طرح اگر ایک عیسائی نماز یاد کر لے تب بھی وہ مسلمانوں کی پنجگانہ نماز میں امامت نہیں کر سکتا؟ چنانچہ اسلام محض چند مخصوص مذہبی رسومات (rituals) کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کا تعلق ایمان اور تقویٰ سے بھی ہے جس کی بنیاد **لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ** کی شہادت دینے پر ہے۔ اس کا انکار کرنے والا چاہے جتنے مرضی سجدے کرے یا اسلام پر بڑی سے بڑی ڈگریاں حاصل کر لے، مسلمانوں کا حکمران یا قاضی نہیں بن سکتا۔ اگر حکمران عوام کو اسی ڈگر پر چلاتے رہے تو پھر وہ دن دور نہیں جب مسلمان عورت کا کافر سے نکاح کرنا اور پاکستان کا غیر مسلم وزیراعظم اور صدر ہونا معیوب نہ سمجھا جائیگا۔

اسلام کی رو سے اسلامی نظریاتی ریاست یعنی خلافت میں کوئی بھی کافر نہ تو حکمران ہو سکتا ہے اور نہ ہی جج۔ اس میں قاضی القضاء، قاضی محتسب یا قاضی عام کی کوئی تخصیص نہیں۔ قاضی کی ذمہ داری فریقین پر اللہ کے حکم کو جاری کرنے کی ہوتی ہے۔ اور وہ شخص جو اللہ پر ہی ایمان نہیں رکھتا اس پر کیونکر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کرتے ہوئے تقویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری دیانت داری کے ساتھ اللہ کا حکم جاری کریگا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح طور پر کافروں کو مسلمانوں کے اوپر کسی بھی قسم کی اتھارٹی اور حکمرانی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾

''اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہرگز کافروں کیلئے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی۔'' (النساء: 141)

قاضی القضاء کا عہدہ مسلمانوں پر غالب ہونے کی ایک سبیل ہے۔ یہی وہ آیت ہے جو مسلمانوں پر کافروں کی حکمرانی اور حاکمیت کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ البتہ ایک غیر مسلم شہری کے دیگر مسلمان شہریوں کی طرح تعلیم، نان نفقہ، جان مال اور عزت وغیرہ سے متعلق تمام حقوق میسر ہوتے ہیں۔ نیز ایک قاضی انصاف فراہم کرتے ہوئے رنگ، نسل اور مذہب کی بنیاد پر فریقین میں تمیز نہیں کر سکتا۔

افسوس کہ اسلامی پارٹیاں آزادی مذہب کے کفریہ افکار سے اس قدر مرعوب ہو چکی ہیں کہ وہ اسلام کے قطعی احکامات امت تک پہنچانے سے بھی شرمندہ اور خائف ہیں۔ کیا علماء جانتے نہیں کہ اسلام کافر جج کی حاکمیت کو قبول نہیں کرتا؟ تو آخر کافر کے چیف جسٹس بننے پر اتنی خاموشی کیوں برتی جا رہی ہے؟ حدود آرڈیننس پر اتنا شور مچایا گیا جبکہ پوری کی پوری عدلیہ کو کافر کے حوالے کرنے کے اس خوفناک فیصلے پر اتنا سناٹا کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اب تمام مسلمان بشمول اسلامی پارٹیاں دل سے یہ حقیقت جان چکی ہیں کہ یہ آئین اپنی اساس میں ایک خالص سیکولر اور کفریہ آئین ہے جس سے کبھی بھی اسلام نہیں پھوٹ سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا علی الاعلان کب اعتراف کرتے ہیں اور اس سے نجات حاصل کرنے کی کب تحریک چلاتے ہیں۔

عوام یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر چیف جسٹس کو دوبارہ فعال کر بھی دیا گیا تو سسکتی انسانیت کو ریلیف یا انصاف نہیں ملے گا۔ پی ایس او اور پی ٹی سی ایل جیسے عوامی اثاثہ جات، جن کی نج کاری حرام ہے، ملٹی نیشنلز اور سرمایہ دار کے ہاتھ بکتے رہیں گے۔ انگریز کا دیا ہوا غیر اسلامی عدالتی نظام عوام پر ظلم کے پہاڑ ڈھاتا رہیگا۔ سود پر مبنی اقتصادی نظام برقرار رہیگا۔ بے گناہ لوگ جھوٹی ایف آئی آر کی بنا پر مقدمہ کے فیصلے سے قبل ہی جیلوں میں سڑتے رہیں گے۔ پاکستان کی سرزمین، اس کی فوج، اس کے وسائل اسلام کے خلاف جاری جنگ میں استعمال ہوتے رہیں گے۔ ایک ایلیٹ گروہ اسمبلیوں میں بیٹھ کر اللہ کی بجائے ازخود قانون سازی کرتا رہیگا۔ یہ سب کچھ اس لئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کیونکہ چیف جسٹس کی موجودگی میں یہ سب کچھ ماضی میں بھی ہوتا رہا اور انہوں نے ان میں سے کسی کو بھی غیر آئینی یا غیر اسلامی قرار نہیں دیا۔

چنانچہ مشرف حکومت اس نظام کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز اور کمزور سے کمزور مزاحمت کو بھی کمانڈو ایکشن کے ساتھ کچل دینا چاہتی ہے۔ حکمرانوں اور عدلیہ میں ہونے والی یہ کشمکش کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہ انسان کا بنایا ہوا غیر اسلامی آئین ہے جو دونوں کے دائرۂ کار اور اختیارات میں توازن قائم نہیں کر سکتا۔ جس کی وجہ سے یہ دونوں ادارے لامحالہ مد مقابل آ کر بحران کا سبب بنتے ہیں جس کے نتیجے میں محض عوام ہی کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ اسی لئے اس آئین کو چلانے والی جمہوری حکومتیں ہوں یا آمرانہ حکومتیں عدلیہ اور ایگزیکٹو کی کشمکش برقرار رہتی ہے۔ نواز شریف کی جمہوری حکومت ہو یا مشرف کی آمرانہ جمہوریت دونوں میں عدلیہ بے توقیر ہوئی اور عوام کو عدل نام کی کوئی شئے نہیں ملی۔ پاکستان کے آئینی مسائل سمیت دیگر مسائل کا واحد حل اسلام کے نفاذ میں پنہاں ہے۔ ہم جب تک اسلام کا نفاذ معاشرتی، معاشی، حکومتی عدالتی نظاموں اور تعلیمی اور خارجہ پالیسیوں میں نہیں کریں گے ہمارے مسائل برقرار رہیں گے اور ایک بحران کے بعد امت دوسرے بحران کا شکار ہوتی رہے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم موجودہ سیکولر آئین اور نظام سے چھٹکارہ حاصل کرتے ہوئے خلافت قائم کریں اور مندرجہ بالا تمام نظاموں میں فقط اسلام ہی کو نافذ کریں۔ صرف اسی صورت میں عوام کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور مسلمان ایک مضبوط اور طاقتور قوم بن کر ابھر سکتے ہیں۔

افغانستان میں عدمِ استحکام کی اصل وجوہات اور اس کا درست حل

ڈاکٹر عبدالواجد
drabdulwajid@hotmail.com

اگرچہ پاکستان میں بہت سے افراد اس حوالہ سے فکرمند ہیں کہ پرویز مشرف امریکی مفادات کی خاطر پاکستانی مفادات کو قربانی کی بھینٹ چڑھا رہا ہے لیکن مشرف اپنے جھوٹ پر ڈٹا ہوا ہے۔ ایک بار پھر فروری میں اسلام آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز میں ہونے والے سیمینار بعنوان ''ایشیا کی آواز برائے امن پروگرام، تعاون اور سلامتی'' سے خطاب کرتے ہوئے مشرف نے دعویٰ کیا کہ ''ہم یہ جنگ کسی کو خوش کرنے کی بجائے اپنی سلامتی کی خاطر لڑ رہے ہیں''

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ پاکستانی معیشت کو امریکہ کی افغانستان میں جنگ کے بدلے اربوں ڈالر کا نقصان پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ امریکی افواج کو قبائلی مجاہدین کے ہاتھوں نقصان سے بچانے کے لیے پاکستانی افواج کے سینکڑوں جوان اپنی جان گنوا چکے ہیں، جیسا کہ وزیرستان میں ہوا۔ ان معاشی اور فوجی نقصانات کے علاوہ پاکستان کو بھارت کے مقابلہ میں سٹریٹیجک حیثیت سے بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس سے قبل افغانستان کی حیثیت پاکستان کے ایک صوبے کی سی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی طرف سے وزیر خارجہ کی بجائے وزیر داخلہ افغانستان کا دورہ کیا کرتا تھا اور افغان انتظامیہ اپنی پریس کانفرنس کرنے کے لیے پشاور کی سرزمین استعمال کیا کرتی تھی۔ لیکن اب انڈیا وہاں پر اپنا دائرہ اثر بڑھا چکا ہے۔ جولائی 2005 میں نئی دہلی کے دورے کے دوران اسی بات کی تصدیق کرتے ہوئے اُس وقت کے افغان وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ نے بتایا تھا کہ بھارت نے افغانستان کے لیے 500 ملین ڈالر امداد کا اعلان کیا ہے۔ اور حال ہی میں 23 جنوری 2007 کو افغانستان کے موجودہ وزیر خارجہ رینگن دادفر کے ساتھ ملاقات کے بعد بھارتی وزیر خارجہ پرناب مکھرجی نے افغانستان کے لیے مزید 100 ملین ڈالر کا اعلان کیا۔

علاوہ ازیں یہ صرف مشرف ہی نہیں جو کہ افغانستان کے مسئلہ میں عوام کو ورغلانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ صدر بش بھی اس کوشش میں ہے کہ امریکی عوام اس بات پر قائل ہو جائے کہ انہیں جلد ہی افغانستان میں کامیابی مل جائے گی۔ لیکن حقائق یہ ہیں کہ امریکہ کی سخت محنت کے باوجود وہ افغانستان میں حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکہ اس مسئلہ سے نبٹنے کے لیے وہاں پر اڈے تعمیر کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔ 29 ستمبر 2004 کو Pentagon's Defence)DSCA (Security Coperation Agency نے کانگریس کو اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا جس میں وہ کابل میں پانچ اڈے اور چار علاقائی کمانڈ سینٹر، جو گردیز، قندھار، ہیرات اور مزار شریف میں ہونگے، تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ 22 دسمبر 2004 کو امریکی افواج کے ترجمان میجر مارک میکن نے تصدیق کی کہ ان میں سے ایک اڈے پر، جو ہیرات میں ایرانی سرحد کے بالکل قریب ہے، پر تعمیراتی کام شروع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ نے نیٹو کو اپنی افواج کی تعداد بڑھانے کا بھی کہا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ امریکہ نے پاکستان پر دباؤ بڑھایا کہ وہ اپنی افواج کی سرحد پر تعیناتی بڑھائے۔ لیکن ابھی تک بش انتظامیہ تذبذب کا شکار ہے۔ 15 فروری 2007 کو امریکی صدر بش نے ایک بار پھر افغانستان میں اپنی ناکام کوششوں پر امریکی عوام کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ ایک مقامی ہوٹل میں ''دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا کہ ''طالبان اور القاعدہ جنگجو پاکستانی ٹھکانوں میں چھپ جاتے ہیں... اور یہ ٹھکانے مزید بھرتی کرنے اور حملے کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔'' پھر بش نے افغانستان میں طاقت کے ذریعے حالات ٹھیک کرنے پر بات کی۔ اس نے کہا کہ ''ہم افغانستان کی سرحد کے ساتھ متحرک افواج کو تیار کرنے میں اس (مشرف) کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم سو کے لگ بھگ بارڈر چیک پوسٹ تعمیر کرنے کے لیے فنڈنگ کر رہے ہیں جو کہ ملک کے ان دور دراز حصوں میں ان کی بہتر رسائی کے لیے مددگار ہونگی۔ ہم نے ان کی افواج کی مدد کے لیے جدید ٹیکنالوجی پر مشتمل آلات دیئے ہیں جن کی مدد سے وہ سرحد پار کرنے والے دہشت گردوں کا پتہ لگا سکیں گے۔ ہم انہیں

ہیلی کاپٹروں اور فکسڈ ونگ طیاروں پر مشتمل ایک ایئر ونگ دے رہے ہیں تاکہ وہ سیکورٹی کو بہتر بنا سکیں، فوری ردعمل ظاہر کریں اور زیادہ سخت نگرانی کر سکیں۔'' تاہم اس وقت یہ مدد بھی کافی نہیں ہے اور امریکہ ایک بار پھر پاکستان کو مزید کچھ کرنے کے لیے زور ڈال رہا ہے۔

امریکہ فوجی اسلوب کے ساتھ ساتھ سیاسی اسلوب بھی اپنا چکا ہے لیکن اسے یہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے امریکہ نے تاجک اکثریتی شمالی اتحاد کے تعاون کے ذریعے افغانستان کے حالات قابو کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے پشتونوں کو مکمل طور پر حکومت سے باہر رکھنے کا فیصلہ کیا، لیکن جب جنوب میں پشتونوں کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو امریکہ نے کرزئی کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ کچھ پشتونوں کی وفاداری کو خرید لے۔ اس نے کچھ ماڈریٹ پشتونوں کی لسٹ بنائی کہ جن کے ساتھ مذاکرات کئے جا سکتے تھے۔ تب ہی امریکہ نے مشرف کی طرف سے کچھ پشتون قبائل کی حمائت حاصل کرنے کی کوششوں کو قبول کر لیا۔ لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ ڈیلز کافی نہیں ہیں۔ چنانچہ 16 فروری 2007 کو امریکی وزیر خارجہ کونڈا لیزا رائس نے ستمبر 2006 میں ہونے والے مشرف حکومت اور قبائلی رہنماؤں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے متعلق اپنی مایوسی کا اظہار کیا، اس نے کہا کہ ''صاف بات یہ ہے کہ اس منصوبے میں کچھ مسئلے اور کچھ تحفظات ہیں''

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کو ہمیشہ اپنے افغانستان کے متعلق منصوبے پر مایوس رہنا پڑے گا۔ وہ بھی برطانیہ اور سوویت یونین کی طرح یہاں پر اپنے پاؤں جمانے میں ناکام رہے گا۔ کیونکہ امریکہ افغانستان کی بنیادی فطرت کو پہچان ہی نہیں سکا ہے۔ افغانستان ایک قبائلی معاشرہ ہے۔ ایک مقام پر یہ قبائلیت اثاثہ ہے لیکن اگر اس کو اگر صحیح طور پر استعمال نہ کیا جائے تو یہ افغانستان کو ناپائداریت کی طرف لے جاتی ہے۔ قبائلیت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ مختلف قبائل کے درمیان خاندانی اور دوستی کا ماحول پیدا کرتی ہے جو جنگ اور سیاست میں بہت مفید ہے۔ تاہم اس کا منفی پہلو دوسرے قبائل کے ساتھ دشمنی ہے جو کہ تقسیم اور تصادم کا باعث بنتا ہے۔

افغانستان کی تاریخ میں ساسنڈز (Sassanids) سے لے کر آج تک کے حکمرانوں نے قبائلیت کو اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا ہے لیکن اس کے نتیجے میں ملنے والا پھل تقسیم اور تصادم کے علاوہ کچھ نہیں۔ ساسنڈز فارسی تھے اور انہوں نے شمال میں بسنے والے پشتونوں کو جنوب میں بسنے والے پشتونوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے درانی پشتونوں کو دوسرے پشتونوں اور غیر پشتونوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کو میونسٹ سوویت یونین نے سنٹرل ایشین قبائل، تاجک اور ازبک قبائل کو پشتونوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔ سویت یونین کے افغانستان سے فوجی انخلاء کے بعد افغانستان مختلف قبائل کی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ تب پاکستان نے ایک پشتون حکومت کی حمایت کی۔ تاہم غیر پشتون عناصر نے اس چیز کو محسوس کیا اور ان کے اندر سے قبائلی جذبات نہ نکل سکے۔ چنانچہ جب امریکہ نے افغانستان کے مسلمانوں کو بلاتخصیص نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا تو اس نے اس قبائلی دشمنی کو استعمال کیا۔ اس نے غیر پشتون شمالی اتحاد کی وفاداریاں خریدیں اور ان کی مدد سے وہاں پر قبضہ جما لیا۔ تاہم امریکہ بھی اس قبائلی دشمنی کے ہاتھوں مار کھائے گا اور افغانستان کے اندر ہمیشہ پھنسا ہی رہے گا۔

قبائلیت افغانستان میں اس طرح رچ گئی ہے کہ وہ اپنے قبائلی مخالفین کو زیر کرنے کے لیے کفار سے مدد لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ ان پر اس بُری طرح اثر انداز ہو رہی ہے کہ ایک ہی قبیلے میں قیادت کے لیے مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک قبیلے کے اندر ہی نچلے درجے کا سردار اپنے سے بڑے سردار پر سبقت حاصل کرنے کے لیے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتا ہے۔ روسی جارحیت کے دوران ایسا ہی ہوا، روس جس کی وفاداریاں خریدنا چاہتا اس کو کمانڈر مقرر کر دیتا۔ ان کمانڈرز کو اس کے بدلے اسلحے اور رقم کا فائدہ دیا جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو پوست کی کاشت کاری اور ہیروئن کے کاروبار کی اجازت بھی دی جاتی تھی۔

نہ روسی، نہ انگریز اور نہ ہی امریکی اس قبائلیت سے نکلنے والے منفی اثرات کو ختم کر سکے۔ جس وجہ سے نہ ہی وہ ان میں مخالفت کو ختم کر سکے اور نہ وفاداریوں کے تبادلے کو روک سکے اور نہ ہی وہ اس قبائلیت کے مثبت اثرات سے فائدہ اٹھا سکے۔ اسلام وہ واحد دین ہے جو اس مسئلے کو حل کرتا ہے۔ ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام نے کس طرح یثرب کے تقسیم شدہ قبائلی معاشرے کو ایک شہر مدینہ منورہ میں تبدیل کر دیا تھا۔

ابنِ ہشام نے بیان کیا ہے کہ کس طرح یثرب کے قبائل یہ جان گئے کہ اسلام میں وہ قوت ہے جو ان کے معاشرے میں بکھرے ہوئے قبائل کو یکجان کر سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خزرج قبیلے کا ایک گروہ حج کے موسم میں مکہ آیا تو اس دوران رسول اللہ ﷺ کی ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی، انہوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ مزید انہوں نے یہ کہا کہ ''ہم اپنے لوگوں (اوس اور خزرج) کو چھوڑتے ہیں جو آپسی بغض اور نفرت کے ذریعے بٹے ہوئے ہیں۔ شاید اللہ آپ کے ذریعے انہیں متحد کرے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ سے مضبوط کوئی شخص نہیں ہوگا'' اور وہ یہ جان گئے تھے کہ قبائلیت نے انہیں تقسیم کر کے آپسی نفرت اور بغض میں ڈال دیا تھا جبکہ اسلام انہیں فوری طور پر متحد کر دے گا۔

اس کے ساتھ ہی اسلام نے قبائلی ڈھانچے کے مثبت پہلو سے فائدہ اٹھایا جو یہ تھا کہ قبائل کے لوگوں کا آپس میں رشتہ نہایت مضبوط تھا۔ چنانچہ جب بیعت عقبیٰ ثانی کے دوران آپ نے اہل قوت کو منظم کرنا چاہا تو آپ نے ان میں موجود سرداری ڈھانچے پر ہی انحصار کیا کیونکہ اس وقت لوگ اپنے سرداروں کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ رکھتے تھے۔ لہٰذا بیعت کی

تیاری کے دوران رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے میں سے بارہ سرداروں کو میرے پاس لاؤ جو تم لوگوں کے امور کو چلاتے ہیں''

چنانچہ یہ اسلام ہی تھا جس نے آ کر ان قبائل کو متحد کر دیا۔ اس سے قبل یہ لوگ یہودیوں اور دوسرے قبائل کے مقابلے میں کمزور تھے کیونکہ یہ تقسیم شدہ تھے۔ لیکن اسلام کے جھنڈے تلے آ کر وہ متحد اور مضبوط ہو گئے۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

''اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پاؤ'' (آل عمران:103)

اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾

''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیے ہیں تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے'' (الحجرات:13)

یقیناً عرب کے قبائل کے لیے اسلام قبول کرنے سے قبل تقویٰ کے نظریہ کو اختیار کرنا نہایت ہی مشکل تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس نظریے پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا بلکہ قبائل کے آپس کے مقابلوں کو اسلام کے فائدے کے لیے استعمال کیا اور یوں وہ لوگ تقویٰ میں برتری حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کرنے لگے۔ چنانچہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کی بابت بار بار پوچھتے جس میں قبائل کے مقابلے میں تقویٰ کو فوقیت دی گئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی فکر کو محسوس کیا اور براہِ راست جواب دیا۔ آپ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم مجھ سے عرب کی نسل کے بارے میں پوچھتے ہو؟'' انہوں نے کہا ''ہاں'' آپ نے جواب دیا: ''جو تم میں زمانہ جاہلیت میں سب سے بُرا تھا وہ قبول اسلام کے بعد سب سے اچھا ہوگا اگر وہ مذہب کے بارے میں سمجھ بوجھ رکھے'' اور یوں رسول اللہ ﷺ نے قبائلی مقابلہ بازی کو تقویٰ میں سبقت لے جانے کے مقابلے میں تبدیل کر دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان رجحانات کو پس پشت ڈالنے کی بجائے ان کو براہِ راست خطاب کرنا چاہیے ورنہ ممکن ہے کہ یہ رجحانات خطرناک ثابت ہوں۔

ایک اور جگہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو بھی قومیت کی طرف بلائے یا قومیت کے لیے لڑے یا قومیت کے لیے اپنی جان دے دے، وہ ہم میں سے نہیں'' اس کے علاوہ اسلام اس بات کی یقین دہانی کرتا ہے کہ مسلمان کی وفاداری صرف اور صرف اسلام کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ کفار کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ افغانستان کے اندر اس رجحان کے غلط ہونے کی وجہ سے کفار کے فوائد کے لیے مسلمانوں نے غداری کی، جس نے بعد میں افغانستان پر نہایت ہی مہلک اثرات چھوڑے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾

'' اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہو حالانکہ انہوں نے اس حق کا انکار کر دیا ہے جو تمہارے پاس آ چکا ہے''

اس کے علاوہ اسلام نے قبائلیت سے نکلنے والے ایک اور رجحان کو بھی خطاب کیا ہے یہ غلط رجحان یہ ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے اوپر بوجھ سمجھے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے جو کہ اس وقت نہایت ہی مہلک ثابت ہو سکتا ہے جب خلافت دوسرے علاقوں کو اپنے اندر ضم کرے گی، جس کا آغاز اللہ کے حکم سے کسی بھی وقت اور کہیں سے بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام ان احساسات کو مضبوطی سے قائم کرتا ہے کہ جس کے ذریعے ایک مسلمان صرف اسلام کی خاطر دوسرے مسلمانوں سے تعاون کرتا ہے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار سے تعاون گناہِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

''نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں مدد نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے'' (المائدہ:2)

افغانستان کی خوشحالی اور اسے مستحکم کرنے کے لیے صرف اسلام ہی ایک صحیح راستہ ہے۔ اسلام نے یثرب کے لوگوں کو ایک موثر قوم میں تبدیل کر دیا تھا پھر اُسی قوم نے بنی نوع انسان تک دعوت پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے تو وہاں کے لوگوں کو اسلام سے دلی محبت ہے۔ یہ اسلام کا جذبہ ہی تھا کہ جس نے ان کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ انگریزوں، روسیوں اور اب امریکیوں کے خلاف مزاحمت کریں اور یہ اسلام ہی ہے کہ جس نے انہیں اس بات پر قائل کیا کہ وہ دنیا میں موجود دوسرے مسلمانوں کی فکر کریں۔ اور اگر ایک دفعہ افغانستان کی سرزمین پر اسلام نافذ ہو گیا تو انشاء اللہ اسلامی ریاست ایک ایسی پالیسی کو فوری طور پر نافذ کرے گی کہ جو قبائل کے ان رجحانات کو آپس کی نفرت میں تبدیل کرنے کی بجائے انہیں اسلام کے جھنڈے تلے اکٹھا کرتے ہوئے انہیں اسلام کے لیے ایک عظیم طاقت بنا دے گی۔ اور پھر یہی لوگ تقویٰ میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔

'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا اسلامی حکم اور اس کا صحیح دائرہ کار

عمران یوسف زئی
imran.yousafzai@yahoo.com

آج پاکستان میں بعض افراد اور گروہ میراتھن ریس کو ڈنڈے کے زور پر روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو بعض دیگر بدکاری کے اڈے اور وڈیو کی دوکانیں زبردستی بند کرواتے ہیں۔ یا پھر اپنے مطالبات منوانے کے لئے پولیس اہلکاروں کو اغوا کرتے ہیں۔ ایسے واقعات درحقیقت اس فرسٹیشن اور غصے کا نتیجہ ہیں جو مشرف حکومت نے گزشتہ سات سالوں کے دوران اپنے غیر شرعی اقدامات کے ذریعے عوام میں پیدا کیا ہے۔ اور یہ گروہ ان غیر شرعی اقدامات کو اپنی سمجھ کے مطابق روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مشرف حکومت سے پہلے حکمرانوں نے بھی اسلام دشمنی اور پاکستان سے غداری کے سیاہ باب رقم کئے، تاہم مشرف اس معاملے میں سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ حکمرانی پر قبضہ کرتے ہی اس نے اپنی سیکولر طبیعت کے برملا اظہار کیلئے کتوں کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور سیکولر مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیا۔ اس نے اسلام کے خلاف امریکی جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی ہونے کا اعلان کیا اور مخالفت کرنے والوں کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے اٹھوا کر غائب کر دیا۔ مشرف حکومت نے امریکہ کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ پاکستان کی فضائی حدود سے افغانستان میں 57,800 سے زائد حملے کریں، جس کے نتیجے میں 80,000 سے زائد مسلمان مشرف کی اقتدار سے محبت کی بھینٹ چڑھ کر شہید ہوئے۔ تعلیمی نصاب کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا۔ ایٹمی سائنسدانوں کو گرفتار اور ایٹمی پروگرام کو امریکی پلان کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دیا۔ کشمیر بیچنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اسی طرح مشرف حکومت نے معیشت میں تباہ کن سرمایہ دارانہ پالیسیوں کے ذریعے دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے اور عوامی اثاثہ جات کی لوٹ مار پرائیویٹائزیشن کو اقتصادی ترقی کا نام دیا۔ نتیجتاً ایک جانب غریب بھوک و افلاس کے گڑھے میں گر کر اپنے جگر گوشوں کو بیچنے اور خودکشیوں پر مجبور ہوئے، دوسری جانب ملک مکمل طور پر استعمار کی گرفت میں چلا گیا۔ اسی طرح میڈیا کو فحاشی و عریانی کا کھلا لائسنس دیا گیا جس کے باعث تمام والدین اپنے بچوں کے مستقبل کیلئے سخت اضطراب کا شکار ہیں اور امت کا غصہ اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا ہے۔ ان سنگین، ہولناک، اور خطرناک حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ بعض لوگ بزور شمشیر سے ان برائیوں کو روکنے کی کوشش کریں۔

تاہم ایک عام آدمی اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہے کہ اس معاملے میں اللہ کا حکم کیا ہے؟ کیونکہ بہر حال یہ سب جانتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن اس بارے میں کنفیوژن موجود ہے کہ ایک فرد یا گروہ ان منکرات کو بزور بازو کیونکہ روک سکتا ہے۔ اس لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس معاملے کو واضح اور مدلل انداز میں بیان کیا جائے تا کہ امت درست طریقے سے ان برائیوں کا سدباب کرنے کے لئے متحرک ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** سے متعلق کئی احکامات دئے ہیں جو قرآنی آیات اور احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ شریعت فرد، گروہ (سیاسی پارٹی)، قوم (امت) اور ریاست سے متعلق احکامات دیتی ہے۔ گو کہ اسلام نے ان تمام پر **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** کو فرض قرار دیا ہے لیکن ان کا دائرہ کار اور طریقہ کار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان مختلف طریقوں اور دائروں کو درست انداز میں نہ سمجھنے کی بنا پر مسائل جنم لیتے ہیں۔ آیئے پہلے ہم ان تمام شرعی دلائل کا جائزہ لیں جو فرد، گروہ، قوم اور ریاست پر **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** کو فرض کرتے ہیں اور پھر فرد، گروہ، قوم اور ریاست کے نہی عن المنکر کے طریقہ کار اور دائرۂ کار کا بھی تفصیلی جائزہ لیں تا کہ یہ جان سکیں کہ کن منکرات کو روکنا فرد کی ذمہ داری ہے اور کون سے منکرات روکنا ریاست کے ذمے آتا ہے۔ نیز اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ کیا چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر برائیوں کو بزور شمشیر روکنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی فرضیت کے دلائل:

اسلامی معاشرہ **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** ہی کی بنیاد پر ایک صالح، پاک صاف اور محفوظ معاشرہ بنتا ہے۔ یہاں مغرب کی طرح لوگ کسی کو برائی کرتے ہوئے دیکھ کر منہ دوسری طرف نہیں پھیر لیتے بلکہ آج بھی معاشرے میں ایسے لوگوں کی ایک خاطر خواہ تعداد موجود ہے جو کم از کم برائی کو برائی قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے شریر لوگ بھی کھلم کھلا برائی کرتے ہوئے گھبراتے ہیں جیسا کہ ہم شراب نوشی اور زنا جیسی قبیح برائیوں کے ضمن میں دیکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرض کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا: **(والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر، او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقابا منہ ثم تدعونہ فلا یستجاب لکم)** "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے ورنہ اس بات کا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب بھیج دے، پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔" (احمد، ترمذی)

فرد کے بارے میں احکامات:

آپ ﷺ نے فرمایا: **(من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک اضعف الایمان)** (صحیح مسلم کتاب الایمان) "جب تم میں سے کوئی کسی منکر کو ہوتا دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اسے دل میں بُرا جانے، اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے"۔ اس حدیث میں ایک مسلمان کو ہر حال میں منکر کو روکنے کا مطلقاً حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس کو استطاعت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔

ایک منظم گروہ، یا پارٹی کے بارے میں احکامات:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ "اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اور در حقیقت یہی لوگ کامیاب ہیں" (آل عمران: 104) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے کہ ان میں کم از کم ایک جماعت ضرور ہو جس کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ یہاں جماعت سے مراد کوئی بھی جماعت نہیں بلکہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کے کام کی نوعیت اس آیت میں بیان کی گئی ہے یعنی اس کا کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور خیر کی طرف دعوت ہو۔ اس وصف کا تعلق حکمران سے بھی ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حکمران ہی ہیں جو معاشرے میں معروف اور منکر کی اہم ترین وجہ ہوتے ہیں۔ حکمران یا تو اپنی رعایا کے معاملات کی اسلام اور شرعی احکامات کے مطابق نگرانی کرے گا، یا اسلامی احکامات میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، جس پر اس کا محاسبہ کرنا فرض ہے۔ چنانچہ انہیں حق بات کی تلقین کرنا اور بری بات سے روکنا اس جماعت کا بنیادی وصف ہونا چاہئے۔ حکمرانوں کا محاسبہ اور انہیں تلقین کرنا سیاسی عمل کہلاتا ہے چنانچہ درحقیقت یہ آیت مسلمانوں کو اپنے درمیان کم از کم ایک سیاسی جماعت کے وجود کا حکم دیتی ہے۔ چنانچہ اگر اسلامی ریاست اور شرعی حکمران ہی موجود نہیں تو اس جماعت کا کام شرع کی طرف سے مقرر کردہ طریقہ کار پر چل کر اسلامی ریاست کا قیام اور شرعی حکمران کو وجود بخشنا ہوگا۔ اور اگر خلافت اور شرعی اولی الامر موجود ہیں تو اس صورت

میں اس منظم گروہ کا کام ان حکمرانوں کا محاسبہ کرنا اور امت میں اسلام کے نفاذ کے لئے رائے عامہ برقرار رکھنا ہوگا۔

قوم یا امت کے بارے میں احکامات:

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو بحیثیت امت بھی منکرات کو روکنے اور معروف کا حکم دینے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (ال عمران : 110) "تم سب امتوں سے بہتر ہو جو انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہو، اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو" نیز آپ ﷺ نے فرمایا: (ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی، ثم یقدرون علی ان یغیروا، الا یوشک ان یعمھم اللہ منہ بعقاب) "کوئی قوم جس کے یہاں گناہ کئے جاتے ہوں پھر وہ ان گناہوں کو روکنے کی قدرت بھی رکھتی ہو تو یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام عذاب میں مبتلا کر دیں"۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا: (ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ، حتی یروا المنکر بین ظھر انیھم و ھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ، فاذا فعلوا ذلک عذب الخاصہ و العامۃ) "اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کے باعث عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ وہ اپنے مابین منکر ہوتا دیکھیں اور اس کو روکنے پر قادر ہوں پھر بھی اس کو نہ روکیں۔ تو اگر وہ لوگ ایسا کریں گے تو پھر عام اور خاص دونوں طرح کے لوگوں پر عذاب نازل ہوگا"۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مسلم امت پر یہ مجموعی طور پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان ہونے والے منکرات کا سدباب کریں جس کی عملی صورت ایک ریاست کے قیام کے ذریعے ہوتی ہے۔

ریاست کے بارے میں احکامات:

اللہ تعالیٰ نے ریاست کی ذمہ داری میں اولین فرض برائی کو روکنے اور حق بات کو نافذ کرنا قرار دیا ہے۔ اہل اقتدار کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ (الحج : 41) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ قائم کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ، اور حکم کرتے ہیں نیکی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے۔ اور اللہ ہی کے ہاتھ میں سب کاموں کا انجام ہے"۔ اسلامی ریاست میں حاکم عوام کا دیکھ بھال کرنے کا ذمہ دار ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (الامام راع و ھو مسؤول عن رعیتہ...) (امام (خلیفہ) راعی ہے اور اسی سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ ہوگی"۔ چنانچہ اسلام یہ ذمہ داری حکمران پر ڈالتا ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس کی رعیت میں تمام افراد اور گروہ اسلامی اوامر کی پاس داری کر رہے ہیں اور تمام برائیوں سے اجتناب کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں اگر اسے زبردستی بھی کرنی پڑے تو شریعت اسے ایسا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ چنانچہ ریاست ہی نیکی کا حکم دینے اور برائی کو روکنے کا اولین اختیار اور طاقت رکھتی ہے۔

فرد، گروہ، قوم اور ریاست کا نہی عن المنکر کا دائرہ کار:

مذکورہ بالا بحث کا حاصل یہ ہے کہ امر بالمعروف کرنا اور منکرات سے روکنا فرد، گروہ، امت اور ریاست پر فرض ہے۔ آیئے اب اس بات کا جائزہ لیں کہ آخر ہاتھ سے روکنے کے ضمن میں فرد، گروہ اور امت کا دائرہ اختیار کیا ہے تاکہ ہم بغیر کسی کنفیوژن کے اسلام کے ان احکامات پر چل سکیں۔

منکرات کو روکنے کے لئے فرد کا دائرہ اختیار:

فرد گروہ، قوم اور ریاست مختلف استطاعت کے حامل ہیں اور ان تمام کے نہی عن المنکر کے طریقہ کار اور دائرہ کار میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی کسی منکر کو ہوتا دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اسے دل میں بُرا جانے" فرد کے نہی عن المنکر کو استطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ چنانچہ حدیث کے مطابق ایک مسلمان کو ہر حال میں منکر کو بزور روکنے کا مطلقاً حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس کو استطاعت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ منکر جسے بزور ختم کرنے پر ایک فرد قادر نہیں، اس کے بزور طاقت نہی عن المنکر کرنے کے دائرہ کار سے باہر ہو جاتا ہے۔ البتہ وہ اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنے یا کم از کم دل میں برا جاننے کا مکلّف ضرور ہے۔ مثلاً ایک فرد انفرادی طور پر ملک میں جاری فحاشی، سودی نظام، ملکی امور میں امریکی عمل دخل اور افغانستان میں حکومتی غداری جیسے منکرات نہیں روک سکتا کیونکہ فرد ہونے کے ناطے یہ تمام اقدامات اس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ اسی طرح وہ تمام منکرات جس کی اجازت خود ریاست فراہم کرتی ہے اور جو قانونی طور پر جائز و حلال ہیں انہیں بھی ایک فرد ہاتھ سے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مثلاً ایک شخص چند کیبل کنکشن کاٹ کر ملک بھر میں گھر گھر پہنچنے والے عریاں چینلز کی ترسیل مکمل طور پر روک نہیں سکتا اور ایسا کرنے کی صورت میں اس سے کہیں طاقتور ریاست اس کا ہاتھ بڑی شدت کے ساتھ روک دے گی۔ یعنی عملی طور پر اس منکر کو معاشرے سے ختم کرنے کی اہلیت ایک فرد کے پاس موجود نہیں ہے۔ جبکہ دوسری طرف چوری، ڈاکہ شراب نوشی، اقدام قتل یا زنا بالجبر وغیرہ وہ تمام منکرات ہیں جنہیں موجودہ ریاستی قانون بھی جرم سمجھتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی شخص استطاعت رکھتا ہے کہ وہ ایک چور کو روک سکے یا ڈاکو کو زیر کر سکے یا شور مچا کر دیگر لوگوں کو اکھٹا کر کے ایک عورت کی عزت بچا سکے تو اس پر ایسا کرنا فرض ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو اللہ کے ہاں گنہگار ٹھہریگا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ افراد کا ہاتھ کے ساتھ نہی عن المنکر کرنے کا دائرہ اختیار حدیث کے مطابق ان تمام اعمال تک محدود ہے جن کو وہ انفرادی طور پر پورا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ تمام جرائم جو نہ صرف اس نظام میں جرم سمجھے جاتے ہیں بلکہ شریعت بھی انہیں حرام قرار دیتی ہے۔ جبکہ وہ تمام حرام اعمال جنہیں اسلام تو جرم قرار دیتا ہے مگر موجودہ کفریہ نظام اس کی اجازت دیتا ہیں تو ان منکرات کو ایک فرد عملاً نہیں روک سکتا۔ مثلاً ویڈیو سنٹر یا سینماء گھر کا مالک منکر کی اصل وجہ نہیں بلکہ منکر کی حقیقی وجہ وہ نظام ہے جو اس کی اجازت دیتا ہے۔ ایسے میں اس منکر کو ختم کرنے کی واحد عملی سبیل اس نظام وحکومت کو ختم کرنا ہوتا ہے جو کفر کی پشت پناہی کر رہا ہوتا ہے جس کی استطاعت فرد واحد نہیں رکھتا۔ ہاں البتہ اس پر زبان سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری بدستور عائد رہتی ہے اس ضمن میں اسے منکرات کو روکنے کے لئے حکمرانوں کو ابھارنا اور ان کی عدم توجہی کی صورت میں حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی تحریک میں شامل ہو کر اپنا فرض پورا کرنا ہوتا ہے۔

قوم یا امت کا منکرات ختم کرنے کا دائرہ کار:

اگر کوئی بھی قوم اپنے ارادے کو کسی بھی منکر کو ختم کرنے کے لئے پرمجتمع کر لے تو پھر وہ من حیث القوم اسے ختم کرنے کی استطاعت حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی اس میں موجود سب سے زیادہ طاقتور طبقہ متحرک ہو جائے تب وہ معاشرے میں موجود کسی بھی منکر کو ختم کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی مثال فوج یا قبائلی معاشرے میں سب سے بڑا اور طاقتور قبیلہ ہوتا ہے۔ لہذا عملی طور پر یہ ممکن نہیں کہ امت ہر منکر کے لئے فرداً فرداً اکٹھی ہو اور اسے ختم کرنے کے لئے اپنے وسائل اور ارادے کو مجتمع کرے۔ بلکہ اسے باطل نظام کو ختم کرنے کے لئے اپنی طاقت کو مجتمع کرنا ہوگا جو ان تمام منکرات کا منبع اور مخرج ہے اور اس کی جگہ اسلامی ریاست قائم کرنا ہوگی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ تمام مسلمان من حیث الامت تمام منکرات کو روکنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لئے وہ تمام منکرات کو روکنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور ان کے دائرہ کار سے کوئی بھی منکر خارج نہیں ہے۔

ریاست کا منکرات ختم کرنے کا دائرہ کار:

ریاست بھی تمام منکرات کو روکنے کی استطاعت رکھتی ہے اور اسی لئے ملک میں ہونے والے ہر منکر کو بزور روکنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ امت ایک اسلامی ریاست قائم کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ براء ہوتی ہے جو ان کے ایما پر تمام منکرات کو روکنے اور تمام معروف کو کرنے کا حکم نہ صرف صادر کرتی ہے بلکہ عملاً اسلام نافذ کر کے اس کی ضمانت دیتی ہے۔ چنانچہ ظالم کا ہاتھ روکنا ہو یا فحاشی کا سد باب، سودی کاروبار ہو یا مغربی ثقافتی یلغار ان جیسے تمام منکرات کا ریاست محض بیک جنبش قلم خاتمہ کرتی ہے۔ اور اس میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو ریاستی مشینری طاقت سے روکتی ہے۔ لہذا ریاست کی رٹ اسلام کے نفاذ کے لئے ہوتی ہے نہ کہ کفر کے نفاذ اور استعمار کے مفاد کو حاصل کرنے کے لئے۔ چنانچہ عملی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ریاست کی ہوتی ہے جو اسلامی احکامات کے نفاذ کے ذریعے عوام سے فرائض پورے کرواتی ہے اور حرام سے روکتی ہے۔

منظم گروہ یا پارٹی کا نہی عن المنکر کا دائرہ کار:

ایک منظم گروہ یا پارٹی کس طرح نہی عن المنکر کرے اس بارے میں امت میں عمومی طور پر ابہام اور غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فرد کے بارے میں وارد شدہ حدیث (جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں) کا اطلاق گروہ پر کر دیا جاتا ہے۔ آیئے اس حدیث کا ایک بار پھر جائزہ لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ ﷺ نے فرمایا: (من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک

اضعف الایمان) (صحیح مسلم) ''جب تم میں سے کوئی کسی منکر کو ہوتا دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اسے دل میں بُرا جانے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے''۔ حدیث کے الفاظ کا بغور جائزہ لینے پر یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ یہ حدیث فرد پر لاگو ہوتی ہے اور اس کا اطلاق گروہ یا ریاست پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ (مَنْ رَای منکم) ''تم میں سے کوئی دیکھے'' ایک فرد کے لئے استعمال ہوئے ہیں اور اس میں واحد کا صیغہ (رَای) استعمال ہوا ہے نہ کہ جمع کا صیغہ (رأیتم) ''تم لوگ دیکھو''۔ نیز اس حدیث کا اطلاق ریاست پر بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آپ ﷺ کے ارشاد کا محور ایک فرد ہے جس کے استطاعت رکھنے یا نہ رکھنے کو بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ اگر ایک شخص ازخود استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ ایک منظم گروہ بنا کر ایک ایک کر کے ان منکرات کے خلاف جدوجہد شروع کر دے۔ ہاں البتہ آپ ﷺ نے اسے اس منکر کے خلاف کلمہ حق بلند کرنے کا حکم ضرور دیا تا کہ اس منکر کے ذمہ دار کے خلاف عوامی رائے عامہ بیدار اور ریاستی طاقت متحرک کی جاسکے۔ چنانچہ اس حدیث کو بنیاد بنا کر ایسے گروہ بنانا جن کا مقصد فرداً فرداً منکرات کو بزورِ شمشیر ختم کرنا ہو سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ آپ ﷺ سے کوئی ایسی حدیث منقول نہیں ہوئی جس میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو منکرات سے روکنے کے لئے گروہ سازی کا حکم دیا ہو نہ ہی آپ ﷺ کے تیرہ سالہ مکی اور دس سالہ مدنی دور میں ریاست سے ماوراء کوئی ایسے گروہ بنانے کی ترغیب یا دلیل ملتی ہے۔ چنانچہ چور کے ہاتھ کاٹنا، قاتل کو قتل کرنا، زانی کو سنگسار کرنا یا شرابی کو درّے لگانا وغیرہ تمام سزائیں ایک فرد واحد یا گروہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ اسی طرح زکاۃ اکٹھی کرنا، عوام سے صوم وصلوۃ کی پابندی کروانا وغیرہ جیسے معروف بھی محض ریاست عملاً نافذ کر سکتی ہے عوام اور گروہ محض اس کے لئے زبانی عوام کو ابھار سکتے ہیں یا ریاستی کوتاہی کی صورت میں اس کا محاسبہ تو کر سکتے ہیں لیکن اسے ازخود عملاً نافذ نہیں کر سکتے۔

منظم گروہ بنا کر ایک ایک منکر کو ختم کرنے کی کوشش کرنا اس لئے بھی درست نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے عوام منکرات کی بنیاد یعنی نظام کو ٹارگٹ کرنے کی بجائے فروعی منکرات کو دور کرنے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً جوئے کے اڈے بند کروانے، سینماء گھر پر تالے لگوانے وغیرہ میں عوامی طاقت صرف ہونے لگتی ہے جو منکرات کے حقیقی سدباب کی منزل، یعنی نظام کی تبدیلی، کو مزید دور دھکیل دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک گروہ جو محض وڈیو سنٹروں کو نشانہ بنائے جبکہ ایسا کرنے سے پورے ملک میں وڈیو سنٹر کا کاروبار قانونی طور پر بدستور چلتا رہے تو اسے منکرات کا خاتمہ نہیں کہا جاسکتا، البتہ ایسا کرنے سے یہ لوگ اپنا غم وغصہ تو ضرور ہلکا کر سکتے ہیں لیکن مسائل کا صحیح حل پیش نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ایسا کرنے سے منکرات حقیقی معنوں میں ختم ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم نے حال ہی میں مخلوط میراتھن کی شکل میں دیکھی جہاں چند گروہوں نے اسے ڈنڈے سے روکنے کی کوشش کی لیکن نظام چونکہ اس قسم کی ریسوں کو شخصی آزادی کی بنیاد پر جائز سمجھتا ہے اس لئے حکومت نے ان NGOs کے پروردہ مٹھی بھر لوگوں کو پولیس کی بھاری نفری کی حفاظت میں اس ریس کی اجازت دے دی اور اب یہ ریس لاہور کی سالانہ تقریبات کا حصہ بن چکی ہے۔ یہی معاملہ تعلیمی اداروں میں کانسرٹس اور فیشن شو رکوانے کے لئے ڈنڈا بردار گروہوں کا ہے جن کے خلاف انتظامیہ پولیس یا رینجرز بلا کر حکومتی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ لہٰذا فحاشی، عریانی، بدکاری، سودخوری، مسلمانوں کی دہشت گردی کے نام پر کافروں کو حوالگی وغیرہ وہ تمام منکرات ہیں جن کا مبداء و مخرج نظام اور حکومت ہے جو نہ صرف ان منکرات کی اجازت دیتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کو تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

درحقیقت ان منکرات کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے گروہ یا پارٹی کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے اور کلمہ حق بلند کرتے ہوئے امت کو اور امت میں موجود طاقتور ترین عنصر کو اپنی قیادت تلے جمع کرنے کی سعی کرے تا کہ ان کی مدد سے اس باطل نظام اور غدار حکومتوں کو اکھاڑ کر اسلامی نظام نافذ کر سکے۔ اس صورت میں محض ایک منکر ختم نہیں ہوگا بلکہ تمام منکرات سے آن واحد میں چھٹکارہ حاصل ہو جائیگا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس پر آپ ﷺ نے اپنے 13 سالہ مکی دور کے دوران عمل کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے گروہ میں حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح وغیرہ جیسے بہادر، طاقتور اور اللہ کے احکامات پر جان چھڑکنے والے ستر سے زائد صحابہؓ موجود تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے ان صحابہؓ کو اسلامی ریاست کے قیام سے قبل مکہ میں موجود منکرات کے خلاف تلوار یا ڈنڈا اٹھانے کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی انہیں ایک عسکری گروہ کی شکل میں منکرات کے خلاف منظم فرمایا۔ جبکہ کعبہ میں برہنہ طواف تک جاری تھا اور 360 سے زائد بت بیت اللہ شریف میں موجود تھے۔ آپ ﷺ کے سامنے حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسر کو اذیتیں دی جاتی رہیں لیکن آپ ﷺ نے صحابہ کو ایک منظم عسکری گروہ کی شکل میں ان تمام منکرات کو ختم کرنے کے لئے متحرک نہیں فرمایا۔ البتہ ان منکرات اور ظلم کے خلاف صحابہؓ سمیت آپ ﷺ کلمہ حق بدستور بلند کرتے رہے اور معاشرے اور ان میں موجود طاقتور عناصر کا ضمیر جھنجوڑتے رہے۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے قریش کی روایات اور نظام کے ساتھ ساتھ ابولہب، ابوجہل اور ولید بن مغیرہ جیسے لیڈروں اور حکمرانوں کو شدید تنقید کا ہدف بنایا۔ نیز اسلام کو بطور ایک متبادل نظام اور رسول اللہ ﷺ کو متبادل لیڈرشپ کے طور پر پیش کیا۔ لیکن افسوس قریش نے، جو کہ مکی سوسائٹی کی سب سے بڑی طاقت تھے، اس حق کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسلام کے نفاذ کے لئے مدد و نصرت حاصل کرنے کے لئے دیگر قبائل کی طرف رجوع کیا۔ آپ ﷺ حج کے موقع پر مختلف قبائلی سرداروں سے ملا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ بنفس نفیس طائف بھی تشریف لے گئے تا کہ وہاں کے سرداروں کو دین حق سے قائل کر کے ان کی مدد و نصرت حاصل کر سکیں جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ ان سے فرماتے: ''مجھ پر ایمان لاؤ اور مجھے نصرت (مدد) دو''۔

یہ مدینہ کے اوس وخزرج کے قبائل کے چند افراد ہی تھے جنہوں نے پہلے پہل اس دعوت کو قبول کیا۔ پھر مصعب ابن عمیرؓ نے ایک سال کے اندر اندر مدینے کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا اور سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذ جیسے دیگر سرداروں نے آپ ﷺ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کو قریش اور تمام عرب کے خلاف نصرت و مدد فراہم کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ آج اسی وجہ سے ہم اوس وخزرج کو انصار کہتے ہیں۔ اس نصرت کے بعد پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی جس نے مدینہ میں حدود نافذ کیں اور منکرات کا خاتمہ کیا۔ نیز اسی ریاست نے اسلامی دعوت کو پوری دنیا تک پھیلانے کی شروعات کی اور کچھ ہی عرصے میں کعبے کے وہی بت جن کو مکی دور میں آپ ﷺ نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا فتح مکہ کے موقعہ پر آپ ﷺ کی چھڑی کے ایک اشارے سے زمیں بوس ہوئے۔ یہ ہے منکرات ختم کرنے کا پائیدار اور مکمل طریقہ جو ہمیں آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ سے ملتا ہے۔ یہ سب اس اسلامی ریاست کی بدولت ممکن ہو سکا جو اپنی اتھارٹی اور رٹ فقط اسلام اور اللہ کی رضا کے لئے استعمال کرتی تھی۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ ایک منظم گروہ کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا طریقہ اور دائرہ کار فرد، امت اور ریاست سے مختلف ہے۔ لہٰذا گروہ کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا طریقہ کار یہ نہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے منکرات کو ہاتھ سے روکنے کے لئے منظم ہو بلکہ اس کی ذمہ داری عوام کو اپنے افکار سے قائل کرتے ہوئے ایک فکری جدوجہد کے ذریعے متحرک کرنا اور ان میں موجود طاقتور عناصر کو اپنے ساتھ جوڑنے کے لئے نصرت طلب کرنا ہے تا کہ ان کی مدد سے کفریہ نظام جڑ سے اکھاڑ کر اسلامی نظام حکومت یعنی خلافت قائم کی جاسکے۔ لہٰذا گروہ کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا طریقہ کار عسکری نہیں ہوسکتا کیونکہ نظام بدلنے کے نبی منہج میں ہتھیار اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سیرہ سالہ مکی دور میں مشاہدہ کیا۔ چنانچہ گروہ کا اصل کام امت کے ذریعے ایسی ریاست کا قیام ہوتا ہے جو امت کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے عملی طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کر سکے۔ لیکن اگر خلافت پہلے ہی سے موجود ہو اور اسلامی نظام نافذ ہو تو ایسی صورت میں منظم گروہ (یعنی سیاسی پارٹی) کی ذمہ داری حکمرانوں کا محاسبہ کرنا اور اسے اسلام پر کاربند رکھنے کے لئے امت میں اسلامی افکار اور اسلامی نظام کے لئے رائے عامہ برقرار رکھنا ہوتا ہے۔

چنانچہ وہ تمام لوگ جو مشرف حکومت کے پھیلائے گئے منکرات کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے گروہ کا حصہ بنیں جو شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کار پر چل کر اسلامی ریاست یا خلافت قائم کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے ہی درحقیقت تمام منکرات کا خاتمہ ممکن ہے۔

شرعی دلائل کی روشنی میں خلافت اور جمہوریت کا تقابلی جائزہ

میگزین رپورٹ

اسلام کا طالب علم جب قرآن وسنت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے ''جمہوریت'' سے متعلق کوئی آیت یا حدیث تو درکنار صحابہ، آئمہ مجتہدین یا فقہاء کا ایک قول بھی نہیں ملتا۔ حالانکہ انسانیت اسلام سے ہزاروں سال قبل جمہوریت سے روشناس ہو چکی تھی۔ وہ اس شش و پنج کا بھی شکار ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا نظام حکومت جمہوریت ہی ہے تو پھر کیا یونانیوں نے اسلام کے آنے سے قبل ہی ازخود ''اسلامی نظام حکومت'' دریافت کر لیا تھا؟ کیا اس ''اسلامی نظام حکومت'' کے نفاذ سے انہوں نے ایک اسلامی معاشرے کو جنم دے دیا تھا؟ کیا وہ نہ جانتے ہوئے بھی اسلام پر ہی چل رہے تھے؟ لیکن تاریخ کے کسی گوشے میں بھی یونانی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں مماثلت کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا۔ اگر رسول مقبول ﷺ جمہوریت ہی دے کر مبعوث کئے گئے تھے تو پھر آپ ﷺ کو یہ ارشاد فرمانے میں کیا تردد تھا کہ وہ وہی نظام لے کر آئے ہیں جو ارسطو اور یونانی فلاسفر انسانیت کو پہلے ہی دے چکے ہیں؟ جبکہ اسلامی عقائد کے بارے میں آپ ﷺ نے بڑے واضح انداز میں فرمایا تھا کہ آپ ﷺ دیگر انبیاء ہی کے دین پر ہیں اور انہیں کوئی نیا عقیدہ دے کر مبعوث نہیں کیا گیا۔

اگر اسلام اور جمہوریت میں کوئی تضاد نہیں تو کیا یہ سیکولر حضرات کے اس دعوے کو مزید مضبوط نہیں کرتا ہے کہ اسلام محض عبادات، انفرادی معاملات اور اخلاقیات سے متعلق قوانین دیتا ہے جبکہ عوام کو اپنے نظام کو اکثریت کی بنیاد پر ازخود قائم کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کو جمہوریت کہنا اسلام پر سراسر تہمت باندھنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک منفرد نظام دے کر مبعوث فرمایا تھا اور اسی کی اتباع مسلمانوں پر فرض قرار دی تھی۔ یہاں تک کہ دیگر انبیاء کی شریعت بھی اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو گئی۔ نیز مسلمانوں کو ان مذاہب سے زندگی گزارنے کے متعلق قوانین سے کچھ بھی اخذ کرنے سے روک دیا گیا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت عمر کو تورات میں زنا سے متعلق حکم تلاش کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جس پر آپ ﷺ کے چہرے مبارک پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فوراً دریافت فرمایا کہ ان سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تو ان کے پاس اس کے سواء کوئی چارہ نہ ہوتا کہ اس کی اتباع کرتے جو میں لایا ہوں۔ اسی کے متعلق قرآن نے ان الفاظ میں حکم دیا:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

''اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے تو (اس کا وہ طریقہ) اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان پانے والوں ہوگا'' (آل عمران: 85)

مزید برآں کچھ لوگ شوریٰ سے متعلق محض دو آیتوں کو بنیاد بنا کر اسلامی نظام حکومت کو شورائی قرار دے کر اسے نہایت ہی مبہم اور غیر واضح بنا دیتے ہیں اور یوں اسے جمہوریت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اسلام کا نظام محض باہمی مشورے تک ہی محدود ہے تو پھر اس وقت کے قریش مکہ بھی شوریٰ ہی کی بنیاد پر نظام چلا رہے تھے تو پھر آخر ایک نیا نظام دینے کی کیا ضرورت تھی۔ قریش کے سردار ''دارالندوی'' میں بیٹھ کر باہم مشوریٰ کرتے اور اس کی بنیاد پر عرب پر حکومت کرتے تھے۔ قریش کے سرداروں کا وہ مشورہ کس کو یاد نہیں جس میں انہوں نے اس معاملے پر شوریٰ بٹھائی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو کاہن کہا جائے، مجنون کہا جائے یا پورے عرب میں ساحر کے طور پر مشہور کیا جائے؟ یا یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو کس طرح قتل کیا جائے؟ لہٰذا اگر حکمرانی کے تمام فیصلے شوریٰ ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں تو پھر اسلامی نظام اور دارالندویٰ کے کفریہ نظام میں کوئی فرق نہیں رہ جائیگا (نعوذ باللہ)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی نظام حکومت میں مشورے کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ درحقیقت اسلام مشورے کو چند مباح معاملات تک محدود کر دیتا ہے جبکہ قوانین کی اکثریت جن کا تعلق معاشرے کی معاشی، حکومتی، تعلیمی، عدالتی اور ثقافتی تنظیم سے ہے یا فرد کی ذاتی زندگی کی اصلاح سے ہے، خلیفہ بغیر کسی اکثریت و اقلیت کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے محض قرآن وسنت سے اخذ کر کے من و عن نافذ کرتا ہے۔

اسلام ہمیں اگر زندگی کے کھانے پینے، طہارت اور لباس جیسے نسبتاً کم اہم احکامات کے متعلق واضح اور تفصیلی احکامات دیتا ہے تو پھر حکومت، معاش اور عدالت جیسے معاشرے کے لئے نسبتاً زیادہ اہم امور پر کیسے خاموش رہ سکتا ہے؟ حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام ہمیں ایک مبہم یا غیر واضح نظام حکومت نہیں دیتا کہ جسے ''شورائی نظام'' کا لیبل لگا کر کسی بھی نظام سے منتھی کر دیا جائے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ ایک منفرد نظام حکومت دے کر مبعوث کئے گئے تھے جو آمریت، بادشاہت، جمہوریت الغرض دیگر تمام نظام ہائے حکومت سے مختلف و منفرد ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر 1300 سال تک مسلمان فقہاء اور مفکرین نے کہیں بھی اسلام کو جمہوریت نہیں سمجھا تو پھر مغرب جمہوریت کے ان کفریہ افکار کو مسلمانوں کے ممالک میں دھکیلنے میں

کیونکر کامیاب ہوا؟ دراصل یورپ کو جب یہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز اسلام ہے اور اسلام کا عقیدہ ہی اس کی عظیم قوت کا منبع ہے تو اس نے عالمِ اسلام کے خلاف ایک ایسی زبردست مشنری اور ثقافتی جنگ شروع کی جس کے ذریعے اس نے اپنی ثقافت اور اپنے افکار کو مسلمانوں کے اندر داخل کیا۔ جمہوریت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنی ثقافت اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی طرف دعوت دی تاکہ وہ جمہوریت کو اپنی فکر کی بنیاد اور زندگی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بنالیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو اسلام سے متنفر اور اس سے دور اور اس کے احکام کے نفاذ سے روکنا چاہتے تھے، تاکہ اسلامی ریاست یعنی خلافت کو ختم کرنا ان کے لیے آسان ہو جائے اور نتیجے کے طور پر وہ اسلام کو زندگی، ریاست اور معاشرے میں لاگو ہونے سے روک سکیں۔ نیز مسلمان ان کے کفریہ افکار، نظام اور قوانین کو اختیار کرلیں۔ اسلام کی بجائے مغرب کے نظام کو نافذ کریں اور اسلام سے دور ہو جائیں اور یوں کافروں کو ان پر غلبہ حاصل ہو جائے۔

یہ مشنری اور ثقافتی جنگ اس وقت شدت اختیار کرگئی جب انیسویں صدی کے آخری نصف میں خلافتِ عثمانیہ اپنے آخری ایام میں تھی۔ مسلمان فکری، علمی اور سیاسی انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ یورپ میں فکری اور صنعتی انقلاب، علمی انکشافات اور ایجادات کے بعد طاقت کا توازن یورپی ریاستوں کے حق میں بہتر ہو چکا تھا، جس کے ذریعے تیز رفتار ترقی کا عمل شروع ہوا۔ جبکہ عثمانی ریاست جامد ہوکر رہ گئی اور روز بروز کمزور ہونے لگی اور اس کی وجہ سے مغربی ثقافت، مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی نظاموں کو مسلمانوں کے علاقوں میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

مغربی ممالک نے اس مشنری اور ثقافتی جنگ میں ایسا خطرناک اسلوب اختیار کیا کہ جس سے اسلام مسلمانوں کی نظر میں بے وقعت ہوکر رہ گیا۔ اس کے احکام کے بارے میں مسلمانوں میں تشویش اور تشکیک پیدا ہوئی اور مسلمانوں کو یہ تأثر دیا گیا کہ اسلام ہی ان کی پسماندگی اور انحطاط کا سبب ہے، جبکہ مغرب کی ترقی کا راز اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کا جمہوری نظام ہے۔ نیز انہی قوانین اور نظاموں کی وجہ سے وہ ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ انداز بھی اختیار کیا گیا کہ مغربی تہذیب اسلامی تہذیب سے متصادم نہیں بلکہ دراصل یہ اسلامی تہذیب ہی سے ماخوذ ہے۔ اس کے نظام اور قوانین اسلامی احکامات کے خلاف نہیں ہیں۔ انہوں نے ان جمہوری افکار اور جمہوری نظام پر اسلام کا رنگ چڑھا دیا اور کہا کہ یہ اسلام کے مخالف یا اسلام سے متصادم نہیں، بلکہ یہ تو اسلام سے ہی ہیں کیونکہ یہ بعینہٖ شوریٰ ہے اور یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حکام کا محاسبہ ہے۔ چنانچہ اس بات نے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا۔ یہاں تک کہ مغربی افکار اور مغربی تہذیب مسلمانوں کے اندر سرایت کرگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اسلام کے ساتھ اپنے مصدر، اپنے عقیدے، اپنی اساس، اپنے افکار اور نظاموں الغرض ہر لحاظ سے متصادم ہے۔ جمہوریت کا منبع انسان ہے اور اس نظام میں محض عقل ہی کسی عمل کے اچھے یا برے ہونے کا حکم لگاتی ہے۔ اس کے بانی یورپ کے وہ فلاسفر اور مفکرین ہیں جو یورپ میں بادشاہوں اور عوام کے درمیان خوفناک جنگ کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔ چنانچہ جمہوریت انسان کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس میں حکمران انسانی عقل ہے۔ گو کہ اسلام مسلمان کو اللہ کے وجود، قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور محمد ﷺ کا رسول ہونے پر عقلی دلائل کی روشنی میں ایمان لانے کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی احکامات کا تعلق ہے تو اس کا ماخذ انسانی عقل نہیں بلکہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی طرف نازل فرمائی جیسا کہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾

''(محمد ﷺ) اپنی خواہشات سے نہیں بولتے، یہ تو صرف وحی ہے، جو ان کی طرف آتی ہے۔''

(النجم:4-3)

وہ اس لئے کہ عقل کے پاس ہر خیر یا شر کا از خود فیصلہ کرنے کی استطاعت موجود نہیں۔ لہٰذا بیشتر معاملات میں انسان مکمل علم و ادراک نہ رکھنے کی وجہ سے کبھی بھی صحیح حل تک نہیں پہنچ سکتا۔ مثال کے طور پر انسان کبھی بھی مرد اور عورت کے مابین پائی جانے والی جسمانی، جذباتی، شعوری اور عقلی مماثلت یا اختلاف کا سو فیصدی ادراک نہیں کرسکتا۔ اس لئے جب بھی وہ ان کے لئے ذمہ داریاں یا حقوق کا تعین اپنی عقل سے کریگا وہ لامحالہ کسی نہ کسی جنس کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو جائیگا۔ ان تمام صلاحیتوں میں جن میں مرد اور عورت بالکل ایک جیسے ہیں ان میں مختلف ذمہ داری دینا ظلم ہے اسی طرح جن صلاحیتوں میں دونوں میں اختلاف ہے ان میں دونوں جنسوں کو ایک ہی ذمہ داری تفویض کرنا بھی انصاف کے منافی ہے۔ کیا عورت کی زچگی کی ذمہ داری کو مرد مساوی انداز میں بانٹ سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر مساوات کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ یہ دونوں جنسیں مختلف ہیں اور خالق کے سوا کوئی بھی انسان ان دونوں میں انصاف پر مبنی تقسیم کار نہیں دے سکتا جو ان کی صلاحیتوں کے عین مطابق ہو۔ انسانی عقل اس سے عاجز ہے کہ وہ انسان کے معاملات اور ان کے باہمی تعلقات کی تنظیم میں مبنی بر انصاف نظام فراہم کر سکے۔ عقل کے اسی عجز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''جنگ تم پر فرض کردی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے خیر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے'' (البقرۃ:216)

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ انسانی عقل محدود ہونے

کی وجہ سے اس امر سے قاصر ہے کہ وہ انسانوں کی تمام ضروریات اور باہمی تعلقات کو منظّم کرنے کے لئے ازخود ایک مربوط نظام مہیا کر سکے جو تمام خامیوں سے پاک ہو۔

چنانچہ انسانی زندگی سے متعلق تمام امور پر احکامات صادر کرنے کے لیے اسلام میں جس چیز کی طرف رجوع کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت ہے نہ کہ انسانی عقل۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾

''حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔'' (یوسف:67)

اور فرمایا:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾

''اگر کسی چیز میں تمہارے درمیان تنازع کھڑا ہو، تو اس کو اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔''

(النساء:59)

جمہوریت جس عقیدے سے نکلی ہے، وہ دین کا زندگی اور ریاست سے علیحدگی کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ اس ''درمیانے حل'' پر مبنی ہے جو عیسائیوں میں سے دینی لوگوں (رجالِ دین) اور اُن فلاسفر اور مفکرین کے درمیان ہوا تھا، جو دین اور رجالِ دین کے اقتدار کے منکر تھے۔ اگرچہ اس عقیدے نے دین کے وجود کا انکار تو نہیں کیا، لیکن زندگی اور ریاست میں اس کے کردار کو معطل کر کے رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں پھر انسان نے اپنے لیے نظام خود بنایا۔

یہ عقیدہ ہی وہ فکری قاعدہ ہے، جس پر مغرب نے اپنے افکار کی بنیاد رکھی اور اسی سے ان کا نظام نکلا۔ اسی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے فکری رخ اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا تعیّن کیا اور اسی سے جمہوری نظام وجود میں آیا۔ اسلامی نظام اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ وہ اُس اسلامی عقیدے پر مبنی ہے جو زندگی اور ریاست کے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق چلانے کو فرض قرار دیتا ہے۔ یعنی ان احکامِ شرعیہ کے مطابق جو اس عقیدے پر مبنی ہیں۔ انسان اپنا نظام خود نہیں بنا سکتا۔ اس پر صرف یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے نظام پر چلے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر اسلامی تہذیب قائم ہے اور زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بھی اسی بنیاد پر ہے۔

جمہوریت جس اساس پر قائم ہے، وہ بنیادی طور پر دو افکار ہیں:

(۱) حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) عوام کی ہے

(۲) قوت کا سرچشمہ (Authority) عوام ہیں

جمہوریت کی رُو سے عوام خود اپنے ارادوں کے مالک ہیں، بادشاہ اور قیصر نہیں اور عوام اپنے ارادے خود نافذ کریں گے۔ بالادست اور اپنے ارادے کا مالک ہونے کی وجہ سے ان کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ایسے قوانین بنائیں گے، جو تمام عوام کی خواہشات کی عکاسی کرتے ہوں۔ وہ قانون سازی کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں گے، جو ان کی نمائندگی کرتے ہوئے قوانین بنائیں گے۔ انہوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعے یہ قانون بھی بنوایا کہ دین کو تبدیل کیا جا سکتا ہے یا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قانون کی رو سے زنا اور لواطت بھی جائز ہیں۔ حتیٰ کہ ان کاموں کو بطورِ پیشہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ جمہوریت میں عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں، اس لیے وہ اپنے من پسند حاکم کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کو ان پر نافذ کرے۔ یہ حاکم کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور حکمران کو تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ طاقت کا سرچشمہ ہیں، اور حکمران ان کے سہارے حکومت کرتا ہے۔

جبکہ اسلام میں بالادستی شریعت کو حاصل ہے، نہ کہ امت کو۔ صرف اللہ تعالیٰ قانون ساز ہے۔ پوری امت مل کر بھی ایک حکم نہیں بنا سکتی۔ چنانچہ تمام مسلمان جمع ہو جائیں اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے سود کے مباح ہونے پر اجماع کریں یا خاص خاص مقامات پر زنا کے جواز پر اجماع کریں تاکہ زنا عام نہ ہو پائے یا انفرادی ملکیت کے خاتمے پر اجماع کریں یا روزے کی فرضیت کو ختم کرنے پر اجماع کریں یا عام آزادیوں کے لیے اجماع کریں تاکہ مسلمانوں کو عقیدے کی آزادی ہو اور جو عقیدہ وہ پسند کریں اسے اختیار کریں یا یہ کہیں کہ مال کو بڑھانے کے لیے کسی بھی طریقہ کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے، اگرچہ وہ طریقہ فی نفسہٖ حرام ہو یا شخصی آزادی کو مباح قرار دیں تاکہ زندگی سے لطف اٹھائیں، خواہ یہ شراب پی کر ہو یا زنا کے ذریعے سے ہو، تو اس اجماع کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ اسلام کی نظر میں اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ مسلمانوں میں سے اگر کوئی گروہ اس قسم کا ارادہ ظاہر کرے تو اس سے قتال فرض ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے رجوع کرے۔ مسلمانوں کے لیے کوئی ایک عمل بھی خلافِ اسلام کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کوئی ایک حکم بنانا بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾

''(اے محمد ﷺ) تمہارے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کو اپنے اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنا لیں۔''

(النساء:65)

اور ارشاد فرمایا گیا کہ حکومت تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ مزید فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾

''کیا آپ (ﷺ) نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو، جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں، اس پر جو آپ کی طرف اور آپ سے پہلے نازل ہوا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم ہو چکا ہے کہ طاغوت کا انکار کر دیں۔'' (النساء:60)

طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے فیصلے غیر اللہ یعنی انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق کرنا۔ ارشاد ہے:

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾

''کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا اور کون ہے؟ یہ بات ایسی قوم کے لیے ہے جو یقین رکھتی ہے۔'' (المائدۃ:50)

حکمِ جاہلیت سے مراد ہر وہ حکم ہے جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر نہیں آئے۔ بلکہ اس کو خود انسان نے بنایا اور ارشاد باری ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

''جو اس (محمد ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنہ یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔'' (النور:63)

رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت سے مراد انسان کے بنائے ہوئے قوانین کو اختیار کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو چھوڑ دینا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَرَدٌّ)

''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں، تو وہ عمل مسترد ہے۔''

اس حدیث میں ہمارے حکم سے مراد اسلام ہے۔

بے شمار آیات اور احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) صرف شریعت کو حاصل ہے اور قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کو قانون سازی کا کوئی حق نہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق سر انجام دے۔ اسلام نے اللہ کے اوامر و نواہی کی تنفیذ کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو نافذ کرنے کے لیے ایک ایسے اقتدار کی ضرورت ہے، جو ان کو نافذ کرے۔ چنانچہ امت کو اختیار دیا گیا ہے، یعنی حاکم کے انتخاب کا حق، تاکہ وہ حاکم اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی نافذ کرے۔

اگرچہ شریعت نے امت کو شریعت کے نفاذ کے لیے اپنا حاکم بذریعہ بیعت منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے، لیکن جمہوری نظام کی طرح حاکم کو معزول کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ اس لیے حدیث میں ہے کہ خلیفہ کی اطاعت فرض ہے چاہے وہ لوگوں کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ اطاعت اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ گناہ کے کام کا حکم نہ دے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰى مِنْ اَمِيْرِهٖ شَيْئًا يَكْرَهُهُ ' فَلْيَصْبِرْ ' فَاِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ ' فَمِيْتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ))

''جو شخص اپنے امیر کے کسی ناپسندیدہ کام کو دیکھے تو اس پر صبر کرے کیونکہ جو جماعت سے ایک بالشت بھی جدا ہوا اور اس حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اور عوفؓ بن مالک سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((...وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ ' قَالَ: قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَفَلا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَذَالِكَ؟ قَالَ: لَا ' مَااَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلَاةَ ' اَلَا مَنْ وَلِيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَآهُ يَأْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ ' فَلْيَكْرَهْ مَايَأْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ ' وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ))

''...اور تمہارے برے اماموں میں سے وہ لوگ ہیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہیں ناپسند کرتے ہیں۔ تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں'' راوی کہتا ہے کہ ہم نے کہا: ''یارسول اللہ (ﷺ)! کیا اس وقت ہم انہیں (حکومت سے باہر نکال) پھینک نہ دیں؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ سنو! جس پر کوئی والی بنا پھر اس نے دیکھا کہ وہ والی ایسا کام کرتا ہے جس میں اللہ کی نافرمانی ہے، تو اس آدمی کو چاہیے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کو تو ناپسند کرے، لیکن والی کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔''

اقامت صلاۃ سے مراد اسلام کے مطابق حکومت کرنا ہے۔ یعنی یہاں جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔

حکمران کے خلاف خروج اس وقت تک جائز نہیں، جب تک کہ وہ کھلم کھلا کفر کا ارتکاب نہ کرے۔ جیسا کہ عبادہؓ بن الصامت کی روایت میں ہے:

((.....فَبَايَعْنَاهُ ' فَقَالَ فِيْمَا اَخَذَ عَلَيْنَا اَنْ بَايَعْنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا ' وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا ' وَاَثَرَةً عَلَيْنَا ' وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهُ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ))

''.....ہم نے آپ (ﷺ) سے بیعت کی۔ آپ نے ہم سے عہد لیا کہ ہم اپنی خوشی و ناراضی، تنگی و فراخی اور ہم پر کسی کو ترجیح دیئے جانے پر بھی سنیں اور اطاعت کریں اور یہ کہ ہم اولوالامر سے جھگڑا نہ کریں۔ (آپ ﷺ نے فرمایا:) مگر اس وقت جب کہ تم کفر بواح (کھلم کھلا کفر) دیکھو، جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل ہو۔''

خلیفہ کو صرف محکمۃ المظالم ہی معزول کر سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ جن امور کی وجہ سے خلیفہ کو معزول کیا جاتا ہے انہیں قاضی کے سامنے اس کو ثابت کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ خلیفہ کو ہٹانے یا اسے برقرار رکھنے کا اختیار محکمۃ المظالم کو حاصل ہے۔

جمہوریت چونکہ اکثریت کی حکومت ہوتی ہے اور اکثریت ہی قانون سازی کرتی ہے۔ اس لیے حکمرانوں، پارلیمنٹ کے اراکین، اداروں اور تنظیموں کے اراکین کا انتخاب اکثریت ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ میں قانون سازی، معاہدے اور فیصلے بھی اکثریت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

لہٰذا جمہوریت میں اکثریت کی رائے حکمرانوں اور عوام سب کے لیے لازمی ہے، کیونکہ اکثریت کی رائے ہی کو عوام کا ارادہ سمجھا جاتا ہے اور اقلیت کے لیے اکثریت کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

اسلام میں یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ **اسلام میں قانون سازی کی بنیاد اکثریت یا اقلیت نہیں بلکہ صرف شرعی نصوص ہیں** کیونکہ قانون ساز صرف اللہ ہے، نہ کہ امت۔ احکام کو اختیار کرنے اور ان کو نافذ کرنے کا اختیار صرف خلیفہ کو حاصل ہے۔ خلیفہ احکامات کو صحیح ترین نصوصِ شرعیہ، جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں سے ہوں، اجتہاد کے ذریعے

حاصل ہونے والی مضبوط ترین دلیل سے اختیار کرے گا۔ خلیفہ کے لیے احکامات میں سے کسی حکم کو نافذ کرنے کے لیے مجلس امت کی رائے لینا جائز ہے، لیکن ضروری نہیں۔ کیونکہ خلفائے راشدین کسی حکم کو اختیار کرتے وقت صحابہؓ کی طرف ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ عمرؓ بن خطاب نے شام، مصر اور عراق کی مفتوحہ اراضی کے بارے میں حکم لگانے کے لیے مسلمانوں سے رائے لی۔

اس لیے خلیفہ احکامات کی ''تبنی'' (کسی حکم کو ملکی قانون کے طور پر اختیار کرنے) کے لیے مجلس امت کی طرف رجوع کرے، تو مجلس امت کی رائے اس کے لیے لازم نہیں، اگرچہ یہ اجتماعی یا اکثریتی رائے ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں اعتراض کرنے والے مسلمانوں کی رائے چھوڑ دی، حالانکہ وہ اکثریت میں تھے، اور معاہدہ کر ڈالا اور ارشاد فرمایا:

(اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ وَلَنْ اُخَالِفَ اَمْرَہٗ)

''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں ہرگز اس کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا۔''

اور صحابہؓ کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ امام (خلیفہ) متعیّن احکام اختیار کر سکتا ہے اور ان پر عمل کا حکم دے سکتا ہے۔ اور مسلمانوں پر اپنی آراء کو چھوڑ کر خلیفہ کے حکم پر چلنا فرض ہے۔ مثلاً ابوبکرؓ نے قرآن وسنت کے احکامات سے اس رائے کو زیادہ درست جانا کہ وہ مسلمانوں میں مالِ غنیمت کی مساوی طور پر تقسیم کریں کیونکہ اس مال پر تمام مسلمانوں کا حق برابر ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کو درست نہ جانا کہ وہ لوگ، جنہوں نے قبول اسلام سے قبل رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی انہیں اس شخص کے برابر مال عطا کیا جائے جس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر جنگ کی یا وہ ضرورت مند کو بھی اتنا ہی دیں جتنا کہ مالدار کو دیا جائے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کے دوران صحابہؓ کی اکثریتی رائے کو مسترد کرتے ہوئے اپنی رائے کو نافذ کیا اور مرتدین زکوٰۃ، جھوٹی نبوت کے دعوے داروں اور رومیوں کے خلاف ایک ساتھ لشکر کشی فرمائی۔ نیز حضرت عمرؓ نے عراق کے مفتوحہ علاقوں پر خراج نافذ کرنے کے اپنے اجتہاد کو نافذ فرمایا اگرچہ حضرت بلالؓ اور اکابر صحابہؓ کا اجتہاد ان سے مختلف تھا۔ مزید برآں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دور خلافت میں طلاق اور وراثت میں اپنے اجتہادات کو نافذ فرمایا جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں انہی مسائل پر مختلف اجتہادات کو لاگو فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے اس طریقہ کار پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے جو ہمارے لئے شرعی دلیل ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ خلیفہ اپنے اجتہاد کے مطابق وہ نافذ کرتا ہے جسے وہ اللہ کا حکم سمجھتا ہے نیز اس پر لوگوں کی اکثریت کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں ہوتا۔ جبکہ مسلمانوں کے لیے ان احکامات کی پابندی کرنا لازم ہے، اگرچہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اس حکم سے متفق نہ بھی ہوں۔ نیز ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کو چھوڑ دیں۔ یہ تبنی شدہ احکامات دراصل قوانین ہوتے ہیں۔ چنانچہ قوانین کی تبنی کرنا صرف خلیفہ کے لیے ہے کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔

خلیفہ کے تبنی شدہ (adopted) احکام کی اتباع اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾

''اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (حکمرانوں) کی بھی۔'' (النساء:59)

اور یہاں اولوالامر سے مراد حکام ہیں۔

اسی سے یہ مشہور فقہی قواعد بنے ہیں:

۱۔ اَمْرُ الْاِمَامِ یَرْفَعُ الْخِلَافَ

''امام کا حکم اختلاف کو ختم کرتا ہے۔''

۲۔ اَمْرُ الْاِمَامِ نَافِذٌ ظَاھِرًا وَبَاطِنًا

''امام کا حکم ظاہری اور باطنی طور پر نافذ ہوتا ہے۔''

۳۔ لِلسُّلْطَانِ اَنْ یُّحْدِثَ مِنَ الْاَقْضِیَۃِ بِقَدْرِ مَا یُحْدِثُ مِنْ مُشْکِلَاتٍ

''سلطان نئے مسائل کے لیے بقدرِ ضرورت نیا حل تلاش کرتا ہے۔''

جہاں تک اقتصادی، اجتماعی، حکومتی اور عدالتی نظاموں، تعلیمی اور خارجہ پالیسی وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ تمام کے تمام خلیفہ مندرجہ بالا اصول کے تحت قرآن وسنت سے مضبوط دلیل کی بنیاد پر تبنی کرتا ہے کیونکہ اسلام ان نظاموں کی مکمل عملی تفصیل دیتا ہے۔ چنانچہ ان قوانین کو قرآن وسنت سے اخذ کرنے میں اسلام ہمیں اکثریت واقلیت نہیں بلکہ قوی شرعی دلیل پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی آپ ﷺ کو ہر معاملے میں اکثریت کی رائے قبول کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾

''اور (اے محمد ﷺ!) اگر آپ لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلیں، جو زمین میں بستے ہیں، تو وہ آپ کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے'' (الانعام:116)

یہ آیت جمہوریت کے بنیادی فلسفے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے۔

لیکن مباح امور میں شوریٰ کا عمل دخل ہوتا ہے جسے بعض لوگوں نے مغالطہ میں پورے حکومتی نظام پر چسپاں کر دیا اور یوں اسے جمہوریت کے مماثل قرار دے ڈالا۔ جبکہ دراصل مباح امور کی دو اقسام میں سے محض ایک قسم میں ہی اکثریتی رائے لازم ہے جبکہ دوسری قسم میں رائے تو لی جا سکتی ہے لیکن اس میں اکثریت کی اتباع لازمی نہیں۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

چونکہ فنی اور فکری امور سے متعلق قانون سازی میں تجربے، سوچ اور غور وفکر ضروری ہے۔ اس لیے اس میں درست رائے کا اعتبار ہوگا، اکثریت اور اقلیت کو نہیں دیکھا جائے گا۔ چنانچہ اس معاملے میں ماہرینِ فن کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ فوجی امور میں فوجی ماہرین، فقہی امور میں فقہاء اور مجتہدین، طبی امور میں ماہر اطباء، انجینیرنگ میں ماہر انجینیرز اور فکری امور میں بڑے مفکرین کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ علیٰ ھٰذا القیاس ان جیسے امور میں رائے اور فکر کی درستی کا اعتبار ہوگا، اکثریت کا نہیں۔ صحیح بات اس کے ماخذ سے لے لی جائے گی اور وہ ماہرین فن ہوں گے نہ کہ اکثریت۔ اس کی دلیل غزوۂ بدر کا

واقعہ ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے حبابؓ بن منذر کی رائے سے اس جگہ کو بدل دیا، جہاں آپ ﷺ اترے تھے او رحبابؓ کی رائے کو ترجیح دی کیونکہ حبابؓ کو ٹھکانوں کا زیادہ علم تھا۔ آپ ﷺ نے اس معاملے میں کسی اور صحابی سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس جمہوری نظام میں پارلیمنٹ کے اراکین، چاہے مسلمان ملکوں میں ہوں، یا مغرب میں، عموماً ماہرین نہیں ہوتے اور ان امور میں گہری سوجھ بوجھ بھی نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان امور میں اراکین کی اکثریت کی رائے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ان کی مخالفت یا موافقت برائے نام ہوتی ہے، کسی علم یا معرفت کی بنیاد پر نہیں۔ چنانچہ ان امور میں اکثریت کی رائے کو اختیار کرنا ضروری نہیں۔

وہ امور جن میں عملی اقدام کی ضرورت ہوتی ہے، سوچ بچار اور غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوتی، انہی امور میں اکثریت کی رائے کو قبول کرنا خلیفہ پر لازم ہوگا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اکثریت ان امور کا ادراک کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی رائے دیں جس میں سہولت اور آسانی ہو یا اس میں مصلحت ہو۔ مثلاً کیا ہم فلاں کو خلیفہ یا اپنا نمائندہ منتخب کریں یا فلاں کو؟ سڑکیں پہلے بنائی جائیں یا ہسپتال؟ سیوریج کا نظام پہلے درست ہو یا مواصلاتی نظام؟ ان جیسے امور کو ہر انسان جانتا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی بھی اچھی رائے دے سکتا ہے۔ تو اس میں اکثریت کی رائے کا اعتبار ہوگا اور اکثریت کی رائے لازم ہوگی۔ اس کی دلیل غزوۂ احد کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور بڑے صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے نہ نکلا جائے، جبکہ اکثریت خصوصاً جوان صحابہؓ کی رائے تھی کہ نکل کر قریش کا مقابلہ کیا جائے۔ گویا رائے نکلنے اور نہ نکلنے کے بارے میں تھی۔ جب اکثریت نے نکلنے کی رائے دی تو رسول اللہ ﷺ اپنی اور کبار صحابہؓ کی رائے رد کرتے ہوئے مقابلے کے لیے مدینہ سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔

جمہوریت کے نمایاں ترین افکار میں سے ایک فکر عام آزادیوں کا نظریہ ہے۔ یہ جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ فرد کی آزادی جمہوری نظام میں ایک مقدس چیز ہے۔ لہٰذا فرد یا ریاست اس آزادی کو ختم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام انفرادی نظام سمجھا جاتا ہے۔ عام آزادیوں کی حفاظت کو ریاست کی اہم ذمہ داریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہر مسلمان اپنے تمام افعال اور اقوال میں نصوصِ شرعیہ کا پابند ہے۔ اس کے لیے کوئی ایسا عمل کرنا یا کوئی ایسی بات کہنا، جو نصوصِ شرعیہ کے خلاف ہو، جائز نہیں۔ اس لیے ایک مسلمان اسی رائے کو اختیار کر سکتا ہے اور اسی کی طرف دعوت دے سکتا ہے، جس کی نصوصِ شرعیہ اجازت دیں۔ مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایسی رائے کا علمبردار بنے یا اس کی طرف دعوت دے، جس کی نصوصِ شرعیہ اجازت نہیں دیتے۔ اگر پھر بھی وہ ایسا کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ لہٰذا مسلمان رائے کے اعتبار سے احکامِ شرعیہ کا پابند ہے، آزاد نہیں۔

اسلام نے زنا، اغلام بازی، ہم جنس پرستی، شراب نوشی، عریانی وغیرہ سب کو حرام قرار دیا اور ان پر سخت سزا مقرر کی ہے۔ اسلام نے اعلیٰ اخلاق اپنانے اور اچھی خصلتیں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اسلامی معاشرہ کو پاکیزگی اور پاک دامنی کا معاشرہ اور بلند اقدار کا معاشرہ بنایا ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ مغربی تہذیب، مغربی اقدار، مغربی نقطۂ نظر، مغربی جمہوریت اور عام آزادیاں اسلامی احکامات سے کلی طور پر متصادم ہیں۔ وہ کافرانہ افکار، کافرانہ تہذیب، کافرانہ نظام اور کافرانہ قوانین ہیں۔ یہ کہنا انتہائی جہالت اور گمراہی ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے اور شوریٰ اسی کا نام ہے اور جمہوریت **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** بھی ہے اور یہی حکام کا محاسبہ ہے۔ شوریٰ، **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** اور حکام کا محاسبہ، یہ سب احکامِ شرعیہ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور مسلمانوں کو ان پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے۔ جمہوریت کوئی حکمِ شرعی نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نہیں، بلکہ اس کو خود انسان نے وضع کیا ہے۔ یہ شوریٰ سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ شوریٰ اظہارِ رائے ہے اور جمہوریت زندگی کے بارے میں ایک نقطہ نظر ہے۔ یہ دستوروں، نظاموں اور قوانین کی قانون سازی ہے، جسے انسان اپنی عقل سے وضع کرتا ہے، عقل ہی کی بنیاد پر اپنے مفادات کے لیے اس کی قانون سازی کی جاتی ہے اور وحی کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

اس لیے مسلمانوں کے لیے اسے اختیار کرنا، اس کی طرف دعوت دینا، اس کی بنیاد پر جماعتیں بنانا، زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کو اپنانا، اسے نافذ کرنا، اسے دستوروں اور قوانین کے لیے اساس بنانا، قوانین اور دستوروں کا اسے مصدر بنانا اور تعلیم یا اس کے مقصد کی بنیاد بنانا بالکل حرام ہے۔

یہ نجس ہے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ یہ طاغوت ہے اور یہی کافرانہ افکار کا مجموعہ ہے۔ یہ کافرانہ نظام اور قوانین کا مرکب ہے۔ اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں پر اسلام کو مکمل طور پر زندگی، ریاست اور معاشرے میں نافذ کرنا فرض ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ ۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾

''اور جو شخص رسول (ﷺ) کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور راہِ راست کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے۔ تو اسے ہم اسی طرف چلتا کر دیں گے، جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے، جو بدترین جائے قرار ہے۔'' (النساء:115)

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو کہ جیسا توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تمہیں اس طرح رزق دے گا جیسے وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ صبح کو ان کا پیٹ خالی ہوتا ہے اور جب وہ واپس لوٹتے ہیں تو ان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے'' (الحاکم)

اسلام پولیس سٹیٹ کے انداز میں حکومت کرنے کو حرام قرار دیتا ہے

اسلام میں لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ریاست پر فرض ہے۔ مسلمان اسلامی احکامات پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ انہیں ریاست کا خوف ہوتا ہے بلکہ وہ اللہ کے خوف سے ان احکامات پر چلتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون حزب التحریر کی کتاب ''اسلام کا نظامِ حکومت'' سے ایک اقتباس ہے۔ جس کے اندر اس بات کو نہایت مدلل انداز سے واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست ایک 'پولیس اسٹیٹ' نہیں ہوتی۔

اسلام میں حکومت اور اتھارٹی سے مراد ہے، احکامِ شریعت کے ذریعے لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرنا۔ اور یہ جبر وقوت استعمال کرنے سے مختلف ہے کیونکہ قوت کو ریاست میں لوگوں کی دیکھ بھال کرنے اور ان کے معاملات کو چلانے کے لیے وضع نہیں کیا گیا۔ قوت اتھارٹی نہیں، اگرچہ اس کا وجود، اس کی تشکیل وتنظیم اور تیاری اتھارٹی کے وجود کے بغیر ممکن نہیں۔ قوت ایک مادی وجود ہے جس کا اظہار فوج کے ذریعے ہوتا ہے، اور اس میں پولیس بھی شامل ہے۔ اس کے ذریعے اتھارٹی یعنی ریاست، احکامات کی تنفیذ کرتی ہے، مجرموں اور باغیوں کو سزا دیتی ہے، احکامات کو توڑنے والوں کو کچلتی ہے اور لوگوں کے جان و مال پر حملہ کرنے والوں سے نبٹتی ہے۔ یہ ریاست کی اتھارٹی کے تحفظ کا ذریعہ ہوتی ہے اور ان افکار وتصورات کی حفاظت کا بھی، جس پر ریاست قائم ہوتی ہے اور جنہیں ریاست پوری دنیا تک پہنچاتی ہے۔

یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اتھارٹی اور قوت ایک نہیں ہیں۔ اگرچہ اتھارٹی کا قوت کے بغیر ہونا ممکن نہیں۔ پس قوت اتھارٹی سے مختلف چیز ہے اگرچہ اتھارٹی کا وجود قوت کے بغیر باقی نہیں رہتا۔

لہٰذا ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ قوت کی شکل اختیار کرلے۔ کیونکہ اگر اتھارٹی محض قوت بن جائے تو لوگوں کے امور کی دیکھ بھال بُری طرح متاثر ہوگی۔ ایسا کرنے سے ریاست کے افکار اور ریاست کا معیار لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کی بجائے جبر، ظلم اور تسلط کرنا بن جائے گا۔ اور حکومت ایک پولیس سٹیٹ میں تبدیل ہو جائے گی جو کہ دہشت پھیلانے، تسلط جمانے، ظلم وزبردستی کرنے اور خون بہانے کے سوا کسی اور چیز سے آشنا نہ ہوگی۔

جس طرح اتھارٹی کا قوت میں تبدیل ہو جانا جائز نہیں اسی طرح قوت کا اتھارٹی حاصل کر لینا بھی درست نہیں۔ کیونکہ وہ قوت کے تصورات کے ذریعے حکومت کرے گی اور لوگوں کے امور کو عسکری قوانین کے تصورات کے مطابق چلائے گی اور اس کا معیار ظلم وجبر ہوگا۔ یہ دونوں صورتیں تباہی وبربادی کا سبب بنیں گی اور خوف ودہشت کی فضاء قائم کریں گی، جس کے نتیجے میں امت تنزلی کے گڑھے میں جا گرے گی اور اسے شدید نقصان پہنچے گا۔ عرب ممالک اور اسلامی ممالک کی حکومتیں اس کی واضح مثال ہیں۔

اسلام مسلمانوں کو ایذا دینے اور ان کی جاسوسی کرنے کو حرام قرار دیتا ہے:

اسلام نے لوگوں کو عذاب دینے اور انہیں ایذا پہنچانے کو حرام قرار دیا ہے۔ مسلم نے ہشام بن حکیم سے روایت کیا، آپ نے کہا: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ((**إن اللّٰه يعذب الذين يعذبون الناس في الدنيا**)) ''اللہ اسے عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتا ہے''

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ((**صنفان من أهل النار لم أرهما، قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس...**)) ''دو طرح کے جہنمی ایسے ہیں جنہیں میں نے ابھی تک نہیں دیکھا؛ کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس ایسے کوڑے ہوں گے جیسے بیل کی دُمیں ہوتی ہیں جس سے وہ لوگوں کو ماریں گے...'' (مسلم نے اس حدیث کو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا)

اسلام نے لوگوں کی ناموس، ان کے مال، عزت اور گھروں کے تقدس کی پامالی کو حرام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((**كل المسلم على المسلم حرام، دمه و ماله و عرضه**)) ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے'' (مسلم نے اس حدیث کو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا)

اور آپ ﷺ نے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: ((**ما أطيبك، و أطيب ريحك، ما أعظمك و أعظم حرمتك، والذي نفس محمد بيده لحرمةُ المؤمن أعظم عند الله حرمةً منك، مالهِ و دمهِ، و أن لا نَظُنَّ به إلا خيراً**)) ''کتنا طیب ہے تو اور کتنی طیب تیری ہوا ہے، کتنا عظیم ہے تو اور کتنی عظیم تیری حرمت ہے۔ لیکن اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اللہ کی نظر میں ایک مومن، اس کے خون اور اس کے مال کی حرمت تجھ سے بڑھ کر ہے۔ اور ہم اس کے متعلق خیر کے سوا اور کچھ گمان نہیں کرتے'' (ابن ماجہ نے اس حدیث کو عبیداللہ بن عمرو سے روایت کیا)

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ((**سباب المسلم فسوق، و قتاله كفر**)) ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے'' (بخاری نے اس حدیث کو عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت کیا)

گھروں کے تقدس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((**لو أنَّ رجلاً اطلع عليك بغير إذن، فحذفته بحصاة، ففقأت عينه ما كان عليك من جناح**)) ''اگر کوئی تمہارے گھر میں تمہاری اجازت کے بغیر جھانکے اور تم پتھر مار کر اس کی آنکھ

پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں'' (مسلم نے اس حدیث کو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا)

اور بخاری اور مسلم نے سہل بن سعد الساعدي سے روایت کیا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے حجرے کی درز سے اندر جھانکا۔ آپ ﷺ اس وقت ایک چھوٹی سی چھڑی سے اپنا سر کھجا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لو أعلَم أنك تنظر لطعنت بها في عينك ، إنما جُعِل الاستئذان من أجل البصر)) ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اندر جھانک رہے ہو تو میں اسے تمہاری آنکھ میں گھونپ دیتا۔ بے شک اجازت لینا (گھر میں) جھانکنے (سے بچنے) کی وجہ سے ہے''

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ((مَن اطلع على قوم في بيتهم بغير إذنهم فقد حل لهم أن يفقأوا عينه)) ''جو دوسروں کے گھروں میں اُنکی اجازت کے بغیر جھانکے تو اُن لوگوں کے لیے جائز ہے کہ اس کی آنکھ پھوڑ دیں'' (احمد نے اس حدیث کو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا)

اسلام نے مسلمانوں پر نظر رکھنے، ان کا پیچھا کرنے اور ان کی ذاتی خبروں کا کھوج لگانے کو حرام قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کی جاسوسی کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا﴾

''اے ایمان والو! بدگمانیوں میں کثرت کرنے سے بچو، بے شک بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور بھید نہ ٹٹولا کرو'' (الحجرات:12)

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((إيّاكم و الظن، فان الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا تجسسوا، ولا تحاسدوا، ولا تدابروا، ولا تباغضوا ، و كونوا عباد اللّٰه إخوانا)) ''بدظنی سے بچو، کیونکہ گفتگو کے دوران بدظنی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور ایک دوسرے کے بھید مت ٹٹولو اور ایک دوسرے کی جاسوسی مت کرو اور ایک دوسرے سے حسد مت کرو اور ایک دوسرے سے پشت مت پھیرو اور ایک دوسرے کے خلاف بغض مت رکھو، اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ'' (بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا)

اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ((يا معشر مَن آمن بلسانه، ولم يدخل الإيمان قلبه ، لا تغتابوا المسلمين، ولا تتبعوا عوراتهم ، فإنه من يتّبع عوراتهم يتبع اللّٰه عورته، و من يتبع اللّٰه عورته يفضحه في بيته)) ''اے لوگو جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہو مگر ایمان ابھی تمہارے قلب میں داخل نہیں ہوا، مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور نہ ہی ان کے عورۃ (خطاؤں) کا کھوج لگاؤ۔ کیونکہ جو مسلمانوں کی خطاؤں کے پیچھے پڑے گا اللہ اس کی خطاؤں کا پیچھا کرے گا اور اللہ جس کے عیبوں کا پیچھا کرے گا، اسے اس کے گھر میں بے نقاب کر دے گا'' (احمد نے اس حدیث کو ابو برزۃ الاسلمی سے روایت کیا)

یہ آیت اور احادیث نبوی مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کی جاسوسی کرنے اور ان کے عیبوں کا کھوج لگانے سے منع کرتی ہیں اور متنبہ کرتی ہیں کہ جو مسلمانوں کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا اللہ اس کے عیوب کے پیچھے پڑے گا اور اسے ذلیل و رسوا کر دے گا۔ اس کے علاوہ مزید احادیث ہیں جو مسلمانوں پر ایسی ایجنسیوں کے لیے کام کرنے کو حرام قرار دیتی ہیں جو مسلمانوں کی جاسوسی کرتی ہوں۔ ابو داؤد اور احمد نے مِسور سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا: ((من أكل برجل مسلم أكلة ، فإن اللّٰه يطعمه مثلها من جهنم ، و من كسا ثوباً برجل مسلم فإن اللّٰه يكسوه مثله في جهنم ...)) ''جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچا کر کچھ کھائے گا، اللہ اس کے مثل اسے جہنم میں کھلائے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کو نقصان پہنچا کر پہنے گا اللہ جہنم میں اسے اس کے مثل پہنائے گا''

جس طرح مسلمانوں کی جاسوسی کرنا حرام ہے اسی طرح اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں یعنی اہلِ ذمہ کی جاسوسی کرنا بھی حرام ہے کیونکہ وہ برتاؤ کے لحاظ سے مسلمانوں کے برابر ہیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت کی اور آپ ﷺ نے انہیں ایذا پہنچانے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((من ظلم معاهداً، أو كلفه فوق طاقته فأنا حجيجه إلى يوم القيامه))

''جو (کفار) معاہدین کو نقصان پہنچاتا ہے یا ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالتا ہے قیامت کے دن میں اس کے خلاف جھگڑا کروں گا'' (اس حدیث کو یحییٰ بن آدم نے کتاب الخراج میں بیان کیا)

اور عمر ؓ نے فرمایا: (أوصي الخليفة من بعدي بذمة رسول اللّٰه ﷺ خيراً أن يوفي لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم ، و أن لا يكلفوا فوق طاقتهم) ''میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان (غیر مسلموں) کے ساتھ اچھا سلوک کرے جو رسول اللہ ﷺ کی پناہ میں آئے۔ وہ ان کے معاہدات کو پورا کرے ان کی حفاظت کے لیے جنگ کرے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے'' (یحییٰ بن آدم نے اسے روایت کیا)

یہ آیت اور احادیث اگرچہ جاسوسی کرنے کے متعلق عام ہیں لیکن حربی کفار اس سے مستثناء ہیں، خواہ وہ حربی فعلاً (یعنی مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں) ہوں یا حربی حکماً ہوں۔ علاوہ ازیں دیگر احادیث جاسوسی کی ممانعت کو غیر حربی کفار کے ساتھ خاص کرتی ہیں۔ جہاں تک حربی کفار کا تعلق ہے تو یہ حرام نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور اسلامی ریاست پر یہ کام سرانجام دینا لازم ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن جحش ؓ کو آٹھ مہاجرین کے ساتھ نَخْلَة روانہ کیا جو طائف اور مکہ کے درمیان ہے، تاکہ وہ قریش کی نقل و حرکت کی ٹوہ لگائیں اور ان کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ دشمن کفار کی جاسوسی کرنا ایک ایسا معاملہ ہے جسے مسلمانوں کی افواج اور اسلامی ریاست کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتی۔

دشمن کفار کی جاسوسی کرنا ایک ایسا فرض ہے جسے

بقیہ صفحہ نمبر 31 پر

''کامیاب عورت'' کا مغربی اور اسلامی نقطہ نظر

میگزین رپورٹ

گزشتہ صدی سے یہ موضوع مسلسل زیرِ بحث ہے کہ معاشرے میں '' کامیاب عورت'' کون ہوتی ہے؟ مغربی معاشرے میں اُس خاتون کو'' کامیاب عورت'' قرار دیا جاتا ہے جو کامیاب معاش رکھتی ہو، جو مالی طور پر خودمختار ہو اور جو گھر اور کار کی مالک ہو۔ لہٰذا ایسی خواتین اس معاشرے میں رول ماڈل (Role model) کے طور پر جانی جاتی ہیں جو مذکورہ بالا معیار پر پوری اترتی ہوں۔ چنانچہ موجودہ برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی بیوی اور بظاہر چار بچوں کی ماں چیری بلیئر جو ایک کامیاب وکالت کا کیریئر (Career) رکھتی ہے، اس کا ذکر اکثر رول ماڈل کے طور پر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اُس معاشرے میں یہ رائے بھی عام ہے کہ باپ یا شوہر پر انحصار کرنا عورت کو معاشرے میں کم تر درجے کا مالک بنا دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عورت جو ماں یا بیوی ہونے کے ساتھ کوئی بھی ذریعۂ معاش نہیں رکھتی اس کی کوئی اہمیت نہیں یا یہ کہ وہ ایک ناکام عورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اُس معاشرے میں جب کسی عورت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ'' آپ کا پیشہ کیا ہے؟'' یا'' آپ کیا کرتی ہیں؟'' تو وہ یہ جواب دیتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتیں ہیں کہ'' میں صرف ماں ہوں'' یا ''میں ایک گھریلو خاتون ہوں''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرے میں ایک پیشہ ور خاتون کو مالِ جنس (Commodity) کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اس کی اہمیت کا دارومدار اِس چیز پر ہے کہ وہ معیشت میں کتنا حصہ ڈال رہی ہے۔

اسی طرح مغربی معاشرے میں تذکیر و تانیث کا معاشرے میں کردار کے حوالے سے بہت بڑی تبدیلی آئی ہے کہ ایک خاندان میں عورت کو بھی کمانے کا اتنا ہی حق ہونا چاہیے جتنا کہ مرد کو۔ چنانچہ 1996 میں کیمبرج یونیورسٹی کی رپورٹ کے مطابق لوگوں کی اس بارے میں رائے کہ یہ صرف مرد کا کام ہے کہ وہ اپنے خاندان کی کفالت کرے، 1984 میں 65 فیصد تھی جو کہ 1994 میں کم ہو کر 43 فیصد رہ گئی۔ اس وقت برطانیہ میں 45 فیصد خواتین کام کرتی ہیں اور امریکہ میں 78.7 فیصد خواتین کام کرتی ہیں۔

جبکہ مغربی حکومتیں کامیاب عورت کے اس معیار کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ایسی عورتوں کی تعریف کی جاتی ہے جو کہ اپنی اس زندگی میں ایک کامیاب کیریئر حاصل کر چکی ہوں۔ مزید برآں ایسی ماؤں کے لیے معاشی فوائد کا اعلان بھی کرتیں ہیں جو کام کرنے والوں میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔ چنانچہ موجودہ برطانوی حکومت نے ایک پالیسی بعنوان ''قومی سٹریٹیجی برائے بچوں کی دیکھ بھال'' متعارف کرائی ہے کہ جس کے مطابق بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بہت سی جگہیں فراہم کی جائیں گی تاکہ وہ عورتیں جو کام کرتی ہیں اپنے بچوں کو دیکھ بھال کے لیے ان جگہوں پر چھوڑ سکیں۔ اسی طرح انہیں مالی فوائد اور ٹیکس میں چھوٹ بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال پر اٹھنے والوں اخراجات کو برداشت کر سکیں۔ چنانچہ ''Full Time Mothers'' نامی تنظیم کا سربراہ جل کربی کہتا ہے کہ ''ایسی عورتوں کے لیے مالی فوائد ہیں جو کام کرتی ہیں لیکن گھر بیٹھی عورتوں کے لیے کوئی مالی فائدہ نہیں''

بدقسمتی سے وہ مسلم خواتین جو مغرب میں رہ رہی ہیں وہ اس سوچ سے بہت متاثر ہوئی ہیں کہ اپنی اس زندگی میں ایک کامیاب کیریئر حاصل کرنا باقی تمام مقاصد سے بڑھ کر ہے۔ وہ بھی اب یہ یقین رکھتی ہیں کہ یہ کیریئر ہی ہے جو کہ عورت کو معاشرے میں مقام اور عزت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شادی دیر سے کرتی ہیں یا وہ شادی کرتی ہی نہیں کیونکہ وہ شادی کو اپنے کیریئر کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ وہ بچوں کی پیدائش بھی دیر سے کرتی ہیں اور تھوڑے بچے پیدا کرتی ہیں یا بچے پیدا ہی نہیں کرتیں۔ اور وہ خواتین جو کوئی کام نہیں کرتیں وہ اپنے معاشرے کی طرف سے مستقل دباؤ کا شکار رہتی ہیں کہ انہیں بھی کوئی کام کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہاں پر موجود مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سوچ سے متاثر ہو چکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے والدین اپنی بیٹیوں کو کامیاب کیریئر اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جبکہ ممکن ہے کہ وہ لڑکی جلدی شادی کرنے کے حق میں ہو اور ماں کا کردار نبھانے کو ترجیح دیتی ہو۔

''کامیاب عورت'' کے اس مغربی معیار کا اسلامی دنیا پر اثر:

مغرب چاہتا ہے کہ مسلمان اُن کے دیئے ہوئے معیارات پر اپنی زندگی کو پرکھے۔ چنانچہ میڈیا کے ذریعے وہ مغربی طرزِ زندگی کو پھیلانے کے لیے دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی یہ رائے پھیلتی چلی جا رہی ہے کہ کامیاب خاتون وہ ہے جس کا اپنا ایک کیریئر ہو۔ حال ہی میں ایک میگزین Working Mother میں افغان عورتوں کے حوالہ سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں لکھا ہے کہ ''بہت سی خواتین معاشی ضرورت کے تحت کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ لیکن افغان خواتین کا ایک بڑھتا ہوا گروہ اپنے کیریئر کے دوبارہ حصول کی کوشش کر رہا ہے۔ تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے، جس کو وہ طالبان کی حکومت کے دوران چھوڑنے پر مجبور تھیں'' اس مضمون میں ایک لڑکی کا انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں کہا گیا کہ وہ افغان خواتین کی اپنے حقوق کی لڑائی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ وہ لڑکی کہتی ہے کہ ''میں نے ان خواتین کو بتایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں کیونکہ تم مردوں کے برابر ہو'' وہ مزید کہتی ہے کہ میں نے انہیں کہا کہ ''برقعے میں مت بیٹھو، گھروں میں مت بیٹھی رہو، باہر نکلو اور اپنے بچوں اور خاوند کو یہ ثابت کر کے دکھاؤ کہ تم ایک عورت ہو، تم ہر کام کر سکتی ہو اور اپنے فیصلے بھی خود کر سکتی ہو''

مزید یہ اسلامی دنیا میں ایسے تصورات کو پروان چڑھانے کے لیے UNIFEM، اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (UNDP)، اقوام متحدہ کا فنڈ برائے آبادی (UNPF) اور دوسرے غیر سرکاری ادارے حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے ہیں۔ 2001 میں UNDP کی طرف سے پاکستان میں ''میڈیا میں عورت کو کیسے پیش کیا جائے'' کے عنوان سے ایک سروے کیا گیا جس میں یہ رائے دی گئی کہ ٹی وی کے ڈراموں اور پروگراموں میں خواتین کو بہادر اور پُراعتماد کردار میں دکھایا جانا چاہیے اور اس سوچ کو ختم کیا جانا چاہیے کہ ایک کامیاب کیریئر کی حامل خاتون آئیڈیل بیوی یا ماں نہیں بن سکتی۔

''کامیاب عورت'' کے مغربی معیار کا اصل ماخذ:

یہ سوچ کہ کامیاب کیریئر کی حامل خاتون ہی ''کامیاب عورت'' ہوتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام سے لیا گیا ہے۔ جس میں مادی فائدے اور نفع کی بنیاد پر کامیابی کو جانچا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خاتون جو کاروبار کرتی ہے، ڈاکٹر ہے، وکیل ہے یا وہ اکاؤنٹنٹ ہے تو وہ کامیاب عورت ہے۔ کیونکہ یہ معاشی لحاظ سے معاشرے میں اپنا حصہ ڈالتی ہے۔ چاہے وہ یہ حصہ خدمات کی شکل میں دے رہی ہو یا پھر ٹیکس کی شکل میں حکومت کو ادا کر رہی ہو۔ اسی طرح ان کے نزدیک ایک گھریلو ماں یا بیوی معاشرے میں کوئی حصہ نہیں ڈال رہی ہوتی۔ اس لیے اسے منفی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے نہ کہ کامیابی کی علامت کے طور پر۔ 2002 میں انسٹیوٹ آف فسکل سٹڈیز (حکومتِ برطانیہ کا مشاورتی ادارہ) نے ایک رپورٹ جاری کی، جس میں یہ واضح طور پر کہا گیا کہ ''بچوں کی موجودگی ماؤں کے لیے روزگار کی فراہمی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور بچوں کی دیکھ بھال کی قابلِ برداشت اور آسان رسائی کی کمی کی وجہ سے ماؤں کی کمائی پر الٹا اثر پڑا ہے۔ صاف گوئی تو یہ ہے کہ موجودہ سٹریٹجی کام نہیں کر رہی اور اس کا خمیازہ معاشی نقصان کی شکل میں موجود ہے''

تذکیر وتانیث کا معاشرے میں کردار کی جو نئی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاتون چاہے وہ ماں ہو یا بیوی اسے اپنا کیریئر جاری رکھنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ ایک مرد کو شوہر یا باپ ہونے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ تعریف مرد اور عورت کی برابری کے مغربی تصورات سے لی گئی ہے۔ یہ تصور یوں ہے کہ یہ دیکھنے کی بجائے کہ معاشرے میں عورت اور مرد کو کیسے دیکھا جاتا ہے بلکہ دونوں کا کردار برابر ہونا چاہیے اور اس کا فیصلہ انفرادی ہونا چاہیے۔ اسی سے یہ نکلتا ہے کہ عورت کو مرد کے برابر روزگار کی فراہمی کا حق ہونا چاہیے اور خواتین وہ کام اور نوکریاں بھی کر سکتی ہیں جو مرد کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی شادی سے متعلق معاملات کا فیصلہ بھی خود کرے یعنی کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرے گی یا کمائے گی۔ برابری کا یہ تصور اپنے اندر ایک ظالمانہ روش رکھتا ہے جو کہ انسانی عقل سے بنائے گئے سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ تصور اس متعصب ماحول کی پیداوار ہے جب انگریز معاشرے میں عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا اور عورت انتہائی مشکل زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ حتیٰ کہ 1850ء تک انگریز قوانین کے تحت عورت کو شہری تک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین کے حقوق اور ان کے لیے برابری کے حق کے لیے آواز بلند کی گئی اس یقین کے ساتھ کہ عورت صرف اسی طرح بہتر معیار زندگی حاصل کر سکے گی جب اس کا اپنا کیریئر ہوگا، وہ مالی طور پر خودمختار ہوگی اور معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرے گی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد کام کرنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ وہ ملک کی معیشت میں اپنا حصہ ڈالیں۔ مغربی طاقتوں نے عثمانی خلافت کے اندر بھی عورتوں کے حقوق اور برابری کی آواز اٹھائی جس کا مقصد عورتوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی بجائے اسلامی ریاست پر کاری ضرب لگانا تھا۔ مغربی مصنف برنارڈ لیوس اپنی کتاب ''The Middle East'' کے باب ''آزادی سے آزادی تک'' میں رقمطراز ہے کہ ''عورتوں کی آزادی کی ایک بڑی وجہ معاشی ضرورت تھی . . . معیشت کے اندر جدت پسندی زنانہ لیبر کی ضرورت کو سامنے لائی اور جسے جدید جنگ میں فوجی بھرتی کی وجہ سے کافی بڑھاوا دیا گیا... عورتوں کی معیشت میں شمولیت اور معاشرتی تبدیلیاں اسی کا نتیجہ ہیں جو جنگ کے دوران اور بعد میں بھی جاری رہیں بلکہ اسی وجہ سے عورتوں کے حق میں قانونی تبدیلیاں بھی کر دی گئیں۔ یہ کچھ حد تک معاشرتی اور خاندانی زندگی پر اثر انداز بھی ہوئیں ہیں''

''کامیاب عورت'' کے اس نقطہ نظر کا خاندانی ڈھانچے پر اثر:

کیریئر کی تلاش کو عورت کی زندگی کا اصل مقصد بنا دینے کی وجہ سے مغربی معاشرے میں بہت سے مسائل نے جنم لیا ہے، خصوصاً اس کی وجہ سے خاندانی ڈھانچے پر نہایت ہی مہلک اثر ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے شادی شدہ زندگی میں تناؤ پیدا ہو رہا ہے اور چونکہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھ کم وقت گزارتے ہیں، اس لیے طلاق کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نظریہ کی وجہ سے بچوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے اور والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ کم وقت گزارنے کی وجہ سے بچوں اور والدین کے درمیان تعلقات میں سنگین قسم کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

یہ مسائل ان مسلم خاندانوں پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں جو اس نظریے سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ شوہر اور بیوی کے کردار کی صحیح وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان بحث ومباحثہ جاری رہتا ہے اور یہی بحث بالآخر طلاق کا باعث بن جاتا ہے۔ بچوں کے معاملے میں ماں اور بچے کا جو قریبی تعلق ہوتا ہے اور جسے مزید پروان چڑھنا چاہیے لیکن اس نظریے کی وجہ سے ماں کی طرف سے بچے کی پرورش اسلامی تہذیب کے مطابق نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ ماں کا بچے کے ساتھ کم وقت گزارنا ہے اور والدین اپنا کیریئر بنانے کے چکر میں بچوں کو ایسی جگہوں پر داخل کرا دیتے ہیں جہاں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ بچے غیر اسلامی شناخت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدین کا کہنا نہ ماننا، انہیں نظر انداز کرنا، شراب پینا

اور منشیات کا استعمال جیسے بُرے کام مغربی معاشرے میں موجود ان مسلم خاندانوں میں عام ہیں جہاں ''کامیاب عورت'' کا یہ نظریہ اپنایا جا رہا ہے۔

''کامیاب عورتوں'' کی خستہ حالی:

وہ لوگ جنہوں نے اصل میں خواتین اور مردوں کے درمیان برابری کا تصور دیا ہے ان کا یقین ہے کہ برابری کا یہ تصور خواتین کو ان کی خستہ حالی سے باہر نکالتا ہے۔ وہ خستہ حالی جس میں مغربی عورت کئی سالوں سے مبتلا تھی اور جسے ریاست کا شہری تک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس تصور کو اپنانے کے بعد بھی کام کرنے والی عورتیں کوئی کم خستہ حال نہیں ہیں، بس وجوہات مختلف ہیں۔ بچوں کی پیدائش میں دیر یا بچے پیدا ہی نہ کرنا یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کیونکہ کیریئر اس بات سے متفق نہیں کہ تولیدی جبلت ہر عورت میں پائی جاتی ہے بلکہ اس کے نزدیک یہ جبلت خستہ حالی کا باعث ہے۔ وہ کیریئر وومین جن کے بچے ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کے ساتھ کم وقت گزارنے کی وجہ سے مستقل طور پر ندامت محسوس کرتی رہتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ خود کو بیوی، ماں اور کام کے درمیان بہت زیادہ مصروف پاتی ہے۔ بہت سے گھروں میں ایک کیریئر وومین اپنی گھر کی ذمہ داریوں کو کم نہیں کر پاتی۔ وہ اپنے کیریئر کو جاری رکھنے کے لیے کام کرتی ہے لیکن گھر کے کام ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر پاتی۔

چنانچہ خواتین کا سارا دن ایک کام سے دوسرے کام کو کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اپنی فیملی کے لیے ناشتہ تیار کرنا، شوہر اور بچوں کے لیے لنچ تیار کرنا، بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجنا، اپنی نوکری کے لیے جانا، دفتر میں پورا دن کام کرنا، پھر سکول سے بچوں کو لینے جانا، رات کا کھانا تیار کرنا، بچوں کا بستر تیار کرنا اور اگلے دن کی تیاری کرنا۔ وہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ اپنا کوئی بھی کام بہتر طور پر نہیں کر پاتیں، کیونکہ ایسی خاتون بہت زیادہ تھکاوٹ اور ٹینشن محسوس کرتی ہے۔ ایک مغربی مصنفہ Lisa Belkin اپنی کتاب "Life's work: Confessions of an unbalanced Mom" میں لکھتی ہیں کہ ''ہم میں سے کوئی ایک خاتون بھی 100 فیصد وقت اپنی نوکری کو نہیں دے سکتی، نہ 100 فیصد اپنی فیملی کو دے سکتی ہیں اور نہ ہی 100 فیصد خود اپنے لیے نکال سکتی ہیں'' یہ ان کامیاب عورتوں کی خستہ حالی نہیں تو کیا ہے؟ مغرب نے آزادی کے نام پر اسے ایک معاشی جنس بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔

برابری کے تصور کی حقیقت:

یہ تصور کہ معاشرے میں تذکیر و تانیث کی برابری خواتین کے لیے ترقی کی راہ متعین کرتا ہے ایک فاش غلطی ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے کسی بھی نظام میں انفرادی لحاظ سے سب کو برابری کا حق دینا ممکن نہیں چاہے یہ مرد اور عورت کے درمیان ہو یا کالے اور گورے کے درمیان یا پھر جوان اور بوڑھے کے درمیان، کیونکہ انسان جب بھی خود قانون بناتا ہے وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں 30 سال سے برابری کے حوالے سے قانون موجود ہیں لیکن ان معاشروں میں خواتین مردوں کے جیسا کام کرنے کے باوجود کم تنخواہ لیتی ہیں۔ یہ اس چیز کو واضح کرتا ہے کہ پوری صدی میں خواتین کے حقوق اور برابری پر بات کی گئی اور پھر بھی بیسویں صدی میں برطانیہ میں صرف 4 فیصد خواتین جج کے عہدے پر فائز تھیں، 11 فیصد مینجر اور FTSE کی 100 میں سے 2 خواتین ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھیں۔

مزید یہ کہ مرد اور عورت پر برابری کیسے لاگو ہو سکتی ہے جو جسمانی اور اعضائی لحاظ سے فطری طور پر ہی مختلف ہیں۔ جیسا کہ ایک مصنف لکھتا ہے کہ ''برابری کے اس تصور میں ایک فطری دباؤ موجود ہے، جو پہلے سے ہی فرض کر لیتا ہے کہ اس میں یکسانیت ہے۔'' یہ ایسا ہی ہے کہ یہ تجویز کر لینا کہ سورج اور زمین چاہے فطرت میں اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا کام ایک جیسا ہونا چاہیے جب زندگی میں کردار اور کام اس طرح سے طے کیے جائیں جس میں مرد اور عورت کی فطرت میں اختلاف کو بروئے کار نہ لایا جائے تو یہ فیصلہ مصیبت اور خستہ حالی کا سبب بنتا ہے جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔

اسلام اور ''کامیاب عورت'' کا صحیح تصور:

اسلام کسی عمل، کام یا شخص کو اس بنیاد پر نہیں جانچتا کہ وہ ریاست کی معیشت میں کتنا حصہ ڈال رہا ہے۔ اسلام کسی مرد یا خاتون کو جانچنے کا پیمانہ یہ بتاتا ہے کہ ان کے اعمال اللہ کے حکم کے مطابق ہیں یا نہیں اور ان کے تقویٰ کا معیار کیا ہے؟ حضور ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حج میں فرمایا: ''کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی برتری حاصل ہے اور نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری حاصل ہے، سوائے تقویٰ اور اصل اعمال کی بنیاد پر'' اس لیے کامیاب عورت وہ ہے جو کہ پُرخلوص ہو کر اللہ کے احکامات کی پیروی کرے، اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ یہ ہمارے اعمال ہی ہونگے جو مرنے کے بعد ہمارے لیے جنت یا دوزخ کا فیصلہ کرائیں گے۔ یہی کامیابی کا صحیح معیار ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے چنانچہ جن معاملات میں مرد اور عورت کی فطری صلاحیتیں ایک جیسی ہیں، ان معاملات میں اسلام نے ان پر فرض بھی ایک جیسے عائد کیے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ تاہم جہاں فطرت میں فرق پایا جاتا ہے تو وہاں فرائض بھی مختلف عائد ہوتے ہیں، اس لیے خاوند اور باپ پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرے اور مالی طور پر ان کی کفالت کرے۔ جبکہ عورت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند اور بچوں کی دیکھ بھال کرے، ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے اور اپنے بچوں کی پرورش اسلامی تہذیب کے مطابق کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے، پس نیک فرمانبردار عورتیں خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت

الٰہی نگہداشت رکھنے والی ہیں'' (النساء:34)

اللہ نے مرد وزن کی ذمہ داریاں بانٹ دیں۔ چنانچہ اسلام نے مرد پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ ماں یا بیوی کے کردار سے بڑھ کر نہیں، بلکہ اس پر عائد کی گئی ذمہ داری کا وہ جوابدہ ہے۔ دونوں فرائض ایک دوسرے کے لیے قابلِ قبول ہیں اور خاندان کو بااحسن طریقے سے چلانے کے لیے نہایت ہی ضروری ہیں تاکہ معاشرہ صحیح طور پر کام کر سکے اور اس میں سکون ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ ''اور اس چیز کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کو ان کے کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کے کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے'' (النساء:32)

برابری کا مغربی تصور انسانی اختراع ہے جو فطرت میں بگاڑ پیدا کرتا ہے اور اسلام میں ایسے تصور کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اسلام میں تمام احکامات خالقِ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں جو مرد اور عورت دونوں کے لیے منصفانہ ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام بنی نوع انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ معاشرے میں اپنی مرضی یا دلی پسند اور ناپسند کے مطابق اپنے فرائض منصبی کا تعین کرے، بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو من وعن قبول کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ جب کوئی فیصلہ کریں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لیے اس فیصلے میں کوئی اختیار نہیں (یاد رکھو) اللہ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا''

(الاحزاب: 36)

اسلام میں ایک عورت کے لیے جائز پیشے:

اسلام میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک عورت کوئی پیشہ اختیار کر سکتی ہے اگر وہ ماں اور بیوی جیسے اپنے بنیادی فرائض کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ تاہم اسلام خواتین کو چند مخصوص پیشے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

1) حکمرانی کا عہدہ جیسا کہ خلیفہ، والی یا عامل: یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلامی معاشرے میں عورت مرد سے کمتر ہے، بلکہ اس کی ممانعت کے خاص دلائل موجود ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو لوگ ایک عورت کو حکمرانی کے عہدے پر فائز کرتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتے'' مزید یہ کہ اسلام میں حکومت کرنا کوئی عزت یا اعلیٰ مرتبہ کی چیز نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ ذمہ داری، لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور ایسا کام جس کا محاسبہ ہوتا ہے، کا معاملہ ہے۔

2) کوئی بھی ایسا کام جس میں عورت کی نسوانیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے: عورت ایسا کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتی جس میں کام کی نوعیت اس کی نسوانیت پر مرکوز ہو جیسا کہ ماڈلنگ اور تشہیر کا کام وغیرہ۔ اسی طرح وہ ایسا کام بھی نہیں کر سکتی جس میں اسے نامحرموں کی موجودگی میں (ہاتھ اور چہرے کے علاوہ) اپنا ستر کھولنا پڑے یا اس کام میں اپنے نامحرموں کو اپنی خوبصورتی کی طرف مائل کرنا پڑے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت سے نوازا ہے اور اس پر فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے نا کہ اس کی نسوانیت کو ایک معاشی چیز سمجھا جائے۔

چنانچہ مسلمان عورت کو یہ تسلی ہونی چاہیے کہ وہ ان کے علاوہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتی ہے جو اسلامی احکامات پر پورا اترتا ہو اور جو اسلامی معاشرتی حدود کے اندر ہو۔ اور یہ بات بھی یقینی ہو کہ اس کام میں کسی نامحرم مرد کے ساتھ خلوئی یعنی اکیلے مرد کے ساتھ تنہائی تو شامل نہیں تاکہ کوئی بھی اس کے کردار پر انگلی نہ اٹھا سکے اور نہ ہی کسی قسم کے شک کا سبب بن سکے۔ نیز یہ پیشہ مردوں کے ساتھ اختلاط کا باعث نہ ہو اور جتنا ممکن ہو سکے اس میں مردوں کے ساتھ قریبی تعلقات کی ضرورت درکار نہ ہو۔

چنانچہ ان پابندیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عورت ڈاکٹر بن سکتی ہے، انجینیر بن سکتی ہے، کاروبار کر سکتی ہے یا سائنسدان بن سکتی ہے یا پھر استاد بن سکتی ہے اور یوں وہ اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

حضور ﷺ کے دور میں بہت سی مسلمان عورتیں کام کیا کرتی تھیں۔ خود حضور ﷺ زوجہ محترمہ حضرت سودہؓ جانوروں کی کھالوں کو رنگنے کا کام کرتی تھیں۔ ایک صحابیہ حضرت کلاؓ تجارت کیا کرتی تھیں، بہت سی ایسی روایات موجود ہیں کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضور ﷺ سے اپنے تجارتی معاملات سے متعلق سوال کیا کرتی تھیں تاکہ ان معاملات میں اسلام کا حکم معلوم ہو سکے۔ جابر بن عبداللہؓ کی چچی کاشت کاری کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح بہت سی خواتین جنگ کے دوران زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک عورت کو قاضی حسبہ بنایا تھا۔

آخری بات:

''کامیاب عورت'' کے مغربی تصور کے مطابق عورت کی حیثیت ایک معاشی چیز سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اسی وقت اس معاشرے کے لیے اہم ہے جب وہ کچھ کما کر انہیں دے رہی ہے۔ استعمار کا فر چاہتا کہ مسلمان عورتیں بھی اسی معیار کو اپنائیں اور اسلامی ممالک میں اس تصور کو پروان چڑھایا جائے۔ وہ تصور جو ان کے اپنے معاشرے میں بدبختی اور مسائل کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کر سکا اور جس نے عورت کو اس کی عزت کی حفاظت کرنے کی بجائے اسے ایک کاروباری اشتہار بنا کر رکھ دیا ہے۔

اسلام عورت کو اس گھٹیا طریقے سے نہیں پرکھتا۔ بلکہ اسلام میں وہ عورت ''کامیاب عورت'' کہلاتی ہے جو اللہ کے احکامات کو پورا کر رہی ہوتی ہے۔ وہ خود کو مرد سے کمتر نہیں سمجھتی بلکہ وہ معاشرے میں اپنے کردار اور فرائض کو اختیار کرنے کی متمنی ہوتی ہے۔ وہ کام تو کر سکتی ہے لیکن اسے وہ اپنی کامیابی سے نہیں جوڑتی اور نہ ہی اپنے رتبے کو اپنے کیریئر سے ماپتی ہے۔ وہ اللہ کے احکامات کو بجالانے کو اپنے لیے فخر کا باعث سمجھتی ہے۔ ایسی عورت ہی ''کامیاب عورت'' ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سعودی عرب کے شہر ریاض میں ہونے والی عرب کانفرنس دراصل امریکہ نے منعقد کی!

جس کا ہدف مسلمانوں کے امور بالخصوص مسئلہ فلسطین پر کاری ضرب لگانا تھا

28اور 29مارچ 2007 کو عرب حکمرانوں نے ریاض میں 19ویں عرب کانفرنس منعقد کی۔ اگرچہ امریکہ اس کانفرنس کے اجلاس میں براہِ راست شریک نہ تھا مگر امریکہ کی سیکرٹری آف سٹیٹ کونڈا لیزا رائس کا عکس کانفرنس کی کاروائی کے دوران سب سے نمایاں تھا۔ رائس بذاتِ خود تو مصر کے شہر اسوان میں تھی مگر کانفرنس سے کچھ ہی عرصہ قبل 24مارچ کو اس نے کانفرنس میں شریک حکمرانوں اور ان کے سیاسی اور انٹیلی جنس عہدیداروں کا اجلاس طلب کیا تاکہ وہ انہیں کانفرنس کے ایجنڈے اور کاروائی کے متعلق بریف کردے اور اُنہیں صدر بش کی اس خواہش کی یاددہانی کرائے کہ عرب حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ یہودی ریاست کی طرف گرم جوشی دکھائیں اور اسے مصالحت آمیز اشارے دیں تاکہ گذشتہ جولائی کی شکست کے بعد یہودی ریاست کو تسلی دی جائے اور اطمینان دلایا جائے!

اس کے بعد کونڈالیزا رائس خطے سے روانہ نہیں ہوئی بلکہ وہ عرب کانفرنس سے ایک رات قبل تک مصر، اردن اور فلسطین کا چکر لگاتی رہی، تاکہ وہ اس بات کو یقینی بنا سکے کہ عرب کانفرنس کی کاروائی اس کی ہدایات کے عین مطابق طے پائے! 27مارچ کو اپنے دورے کے اختتام سے قبل اس نے عرب حکمرانوں کو نصیحت کرتے ہوئے یہ نقطہ ان کے سامنے رکھا کہ وہ یہودی ریاست کی طرف مزید قدم بڑھائیں اور جو کچھ اب تک انہوں نے کیا ہے اس سے زیادہ کریں، تاکہ یہودی اس بات پر قائل ہوسکیں کہ 'ان کی سرزمین' کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے گا۔ درحقیقت اپنے دورے کے آغاز سے قبل رائس نے واشنگٹن پر واضح کیا تھا کہ وہ امید کرتی ہے بلکہ وہ اس بات کو یقینی بنائے گی کہ عرب حکمران The Arab Peace Initiative یعنی ''عرب امن اقدام'' کے منصوبے کا اعلان کریں، جسے انہوں نے 2002 کی بیروت کانفرنس میں تسلیم کیا تھا اور وہ اس پر اسی طریقے سے عمل درآمد کریں جیسا کہ انہیں بتایا گیا ہے۔ اس امر کی تصدیق اُس وقت ہوگئی جب آج حتمی اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں واضح طور پر ''عرب امن اقدام'' کے منصوبے میں روح پھونکنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، جو بنیادی طور پر ایک امریکی سازش ہے، جسے تھامس فرائیڈمین نے وضع کیا تھا اور جسے شہزادہ عبداللہ نے اختیار کیا اور 2002 کی بیروت کانفرنس میں پیش کیا۔ بیروت کانفرنس نے اس منصوبے کو قبول کیا اور اسے ''عرب امن اقدام'' کا نام دیا۔

یہ امریکہ ہی تھا جس نے ''نیو کنزرویٹو'' انتظامیہ کے تحت اس بات کو پختہ کیا کہ عرب حکمران واضح اور غیر مشروط انداز میں اور کھلم کھلا طور پر یہ تسلیم کریں کہ فلسطین کا مسئلہ ان علاقوں تک ہی محدود ہے جس پر اسرائیل نے 1967ء میں قبضہ کیا تھا، اور اس میں وہ علاقے شامل نہیں جن پر اسرائیل نے 1967ء سے قبل قبضہ کیا تھا۔ یہ تنازعہ اس فریم ورک کے اندر ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں اور کسی فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے لو اور دو کی بنیاد پر ہونے والے مذاکرات اسی فریم ورک تک محدود ہوں گے۔ جہاں تک فلسطین کے اُن علاقوں کا تعلق ہے جن پر یہودیوں نے 1948ء میں قبضہ کیا تھا تو وہ خالصتاً یہودی علاقے ہیں، اور عرب حکمرانوں کی دستخط کردہ قانونی دستاویزات کے مطابق ان علاقوں پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا!

امریکہ عرب حکمرانوں سے یہ قانونی ہتھیار حاصل کرنا چاہتا تھا، جس کی بعد میں فلسطین کے لوگ توثیق کریں۔ لیکن اُس وقت فلسطینی اتھارٹی پر ایسے لوگوں کی حکمرانی تھی جو سیکولر کہلاتے تھے، جبکہ امریکہ چاہتا تھا کہ اس دستاویز کی توثیق ایسی فلسطینی حکومت کرے جو سیکولر اور اسلامی دونوں طرح کے لوگوں کی نمائندگی پر مشتمل ہو۔ یہ اس بات کے مترادف ہوگا کہ اہلِ فلسطین بذاتِ خود مجموعی طور پر 1948ء کے مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہوگئے ہیں، نہ کہ صرف عرب حکمران! یہ امن منصوبہ پانچ سال تک سرد خانے میں پڑا رہا یہاں تک کہ مکہ معاہدہ طے پایا، جو تمام بین الاقوامی اور علاقائی معاہدات کی پابندی کرنے اور ان کا احترام کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، جس کا دوسرا مطلب یہودی ریاست کو تسلیم کرنا ہے۔ اس پس منظر کے ساتھ فلسطین میں قومی حکومت تشکیل دی گئی، جس نے اس 'عرب امن اقدام' کو قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ یہ عرب اقداماتی منصوبہ چند معمولی اور غیر اہم تفصیلی تبدیلیوں کے علاوہ معاہدۂ مکہ سے چنداں مختلف نہیں۔ امریکہ کے مطابق اب سیکولر اور اسلامی لوگوں کی قومی حکومت کی شکل میں تمام فلسطینیوں کو نمائندگی حاصل ہے، لہٰذا امریکہ نے اس منصوبے کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا اور اسے ریاض میں عرب حکمرانوں کی کانفرنس کے سامنے پیش کیا تاکہ اس منصوبے کو حتمی شکل دی جائے۔ عرب حکمرانوں کی طرف سے اس طرح کی پے در پے رعایتوں اور دستبرداریوں نے نیو کنزرویٹوز کو اس قابل بنایا کہ وہ

یہودی ریاست کو ایک جامع تحفہ پیش کریں۔

اے مسلمانو! بیروت کانفرنس کے موقع پر ''عرب امن اقدام'' کے نام پر امریکہ 1948ء کے مقبوضہ فلسطینی علاقے کو عرب حکمرانوں کی ڈکشنری سے کھرچ ڈالنے میں کامیاب رہا اور آج ریاض کانفرنس کے موقع پر وہ فلسطینی اتھارٹی کے سیکولر اور اسلامی دونوں دھڑوں کی طرف سے امن اقدام کی قبولیت کو دوبارہ پختہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے، اور یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ فلسطین کے لوگ اس امن اقدام کے منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔

عرب حکمران اس امن اقدام کی قبولیت ظاہر کرتے ہوئے جشن منا رہے ہیں جبکہ یہ محض ذلت و رسوائی اور یہودیوں کے سامنے واضح پسپائی ہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ اس منصوبے کے ذریعے وہ 1967ء کے مقبوضہ فلسطینی علاقے کو حاصل کر لیں گے اور فلسطینی ریاست قائم کر سکیں گے۔ دراصل یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ یہودیوں کا مقابلہ کرنے، انہیں شکست دینے اور تمام تر فلسطین کو آزاد کرانے کی طاقت نہیں رکھتے!

درحقیقت یہ عرب حکمران جھوٹ بول رہے ہیں۔ اگر یہ حکمران اپنی افواج کو متحرک کریں اور ہر قابلیت رکھنے والے مسلمان کو ان افواج کے ساتھ شامل ہو جانے کی طرف پکاریں، تاکہ یہودیوں کے ساتھ ایک حقیقی جنگ لڑی جائے (نہ کہ ماضی کی مانند ایک مصنوعی جنگ) تو یہ یہودی ریاست کو مٹانے کے لیے کافی ہے۔

اگر مسلمانوں کی سرزمین کا ایک بالشت برابر ٹکڑا بھی مقبوضہ ہو تو یہ امر مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اسے آزاد کرانے کے لیے افواج کو متحرک کیا جائے اور یہ کہ مسلمان قابض طاقت کے ساتھ حالتِ جنگ کو اس وقت تک برقرار رکھیں جب تک کہ اس بالشت برابر زمین کو بھی قابض طاقت سے آزاد نہ کرا لیا جائے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ 1967ء کے مقبوضہ علاقے پر ریاست قائم کرنے کے بدلے 1948ء کے مقبوضہ فلسطین سے دستبرداری ایک عظیم غداری اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مؤمنین کے ساتھ خیانت ہے۔ اور اس کا ارتکاب کرنے والے اس دنیا میں بھی ذلیل و رسوا ہوں گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے، اگر وہ واقعی اس بات کو جانیں۔ اور اگر کوئی شخص اس بات کو نظر انداز کرنے کو ترجیح دیتا ہے، تو اسے یہ جان لینا چاہئے کہ یہ امن اقدام اور اس طرح کے ہزاروں اقدام بھی 1967ء کے مقبوضہ فلسطینی علاقے کو یہودیوں کے پنجے سے آزادی نہ دلا سکیں گے۔ جب سے برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے یہودیوں کو فلسطین میں بسایا اور ان کے لیے ایک ریاست بنائی، یہ ان یہودیوں کا وصف رہا ہے کہ جب بھی ان کے دشمن نے کوئی چیز ان کے حوالے کی انہوں نے اس سے مزید کا مطالبہ کیا! ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ایک دشمن ایک مرتبہ انہیں رعایت دے سکتا ہے تو اسے بار بار رعایتیں دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور جو ایک حصے سے دستبرداری کو قبول کر سکتا ہے وہ کئی حصوں سے دستبرداری کو بھی قبول کر لے گا۔ لہٰذا جب بھی دشمن انہیں کوئی رعایت دیتا ہے تو وہ اسے اپنے حق میں ایک جیت تصور کرتے ہیں اور مزید فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ ایک نہ ختم ہوتا سلسلہ ہے۔ یہودی یہ گیم کھیلتے رہیں گے اور 1967ء کے مقبوضہ فلسطین کو کترتے رہیں گے؛ جب تک کہ انہیں جنگ میں شکست نہ دی جائے اور ان کی ریاست کو صفحہ ہستی سے نہ مٹا دیا جائے۔ اس ذہنیت کے ساتھ سرحدوں کی ردوبدل اور یہودی بستیوں کے قیام کے مطالبے کے ذریعے اور اس مطالبے کے ذریعے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلے کو غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے تک محدود کر دیا جائے یہاں تک کہ فلسطینیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ان علاقوں کے ایک حصے پر آباد ہونے کو قبول کر لیں اور پورے علاقے کا مطالبہ نہ کریں، اور القدس کے ثقافتی ورثے کو تباہ کرنے کے ذریعے، جو کہ انہیں تحفے کے طور پر دے دیا گیا تھا، خواہ وہ عیزریہ کا علاقہ ہو یا ابی دیس کا، یہ یہودی امن اقدام کے منصوبے کی شکل وصورت کو مسخ کرتے رہیں گے، اگرچہ یہ منصوبہ پہلے ہی نہایت بدنما ہے۔ یہودیوں کو یقین ہے کہ وہ یہ سب حاصل کر لیں گے اور وہ پر اعتماد ہیں کیونکہ جنہوں نے 1948ء کے مقبوضہ فلسطین کو ان کے حوالے کر دیا وہ 1967ء کے فلسطین سے بھی تھوڑا تھوڑا کر کے دستبردار ہو جائیں گے اور انہیں اللہ یا اس کے رسول ﷺ یا مومنین سے کوئی شرمندگی نہ ہو گی۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے: ''جو ذلت کو پسند کرتا ہے اس کے لیے ذلت آسان ہو جاتی ہے'' اور ''مردے کو زخم کی تکلیف نہیں ہوتی''۔

ریاض میں اعلان کردہ یہ امن اقدام یہودیوں کے لیے تحفہ ہے جو اُس تحفے سے بڑھ کر ہے جو انہیں 2002 کی بیروت کانفرنس میں دیا گیا کیونکہ عرب حکمرانوں نے 1967ء کے مقبوضہ علاقے کے کچھ حصے پر ایک چھوٹی سی ریاست کے بدلے 1948ء کے مقبوضہ فلسطین سے دستبرداری کے سودے کی قانونی دستاویز پر دستخط کر دیے ہیں۔ جو چیز یہودیوں کے لیے سونے پر سہاگہ ہے وہ یہ ہے کہ اس مرتبہ سودے بازی کی اس دستاویز پر فلسطین کی متحدہ قومی حکومت نے بھی دستخط کر دیے ہیں جس میں سیکولر لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام پسند کہلاتے ہیں۔ دراصل یہی وہ چیز ہے جس کی طرف سعودی عرب کے سعود الفیصل نے اشارہ کیا، جب اس سے سوال کیا گیا کہ اس کانفرنس میں نئی چیز کیا ہے تو اس نے اپنے جواب میں اس بات پر زور دیا کہ فلسطین کی متحدہ قومی حکومت نے عرب ممالک کے ساتھ عرب اسرائیل تنازعے کے حل کی تلاش کے لیے عرب لائحہ عمل پر اتفاق کیا ہے۔

اے مسلمانو! عرب کانفرنس کے موقع پر عرب حکمرانوں نے مسئلہ فلسطین کو نقصان پہنچانے پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ وہ مسلمانوں کے تمام مسائل کے متعلق امتِ مسلمہ کو زخم لگاتے رہے ہیں:

انہوں نے صومالیہ کی عبوری حکومت کی حمایت کی جسے امریکہ نے بنایا تھا، جس نے امریکی احکامات کے تحت ایتھوپیا کی افواج کے صومالیہ پر قبضے کی راہ ہموار کی۔ جب فرانس نے اپنے ایجنٹ چاڈ کے ذریعے دارفور کے تنازعے کو ہوا دی تو عرب حکمرانوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا گوارہ نہ کیا، اور یوں

سوڈان میں امریکی اور برطانوی فوج کی مداخلت کی راہ ہموار ہوئی۔ عرب حکمرانوں نے اس بحران کے پیچھے کارفرما اصل وجوہات کے متعلق کچھ نہ کہا اور جب بحران اپنے عروج پر تھا تو انہوں نے اسے نظر انداز کرنے کو ترجیح دی۔ جب امریکہ نے عراق پر قبضہ کیا تو یہ حکمران تالیاں بجاتے رہے! اور جب عراق میں مقبوضہ افواج کی درندگی میں اضافہ ہوا تو ایک شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس دوران امریکہ اور عرب حکمرانوں کی دوستی اور محبت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح ان حکمرانوں نے لبنان کے مسئلے کو فرانس اور امریکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، جو اس مسئلے پر آپس میں نبرد آزما تھے، اور خود خاموشی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا!

علاوہ ازیں یہ حکمران حقائق کو توڑتے مروڑتے ہیں اور حق بات کو چھپاتے ہیں۔ وہ فلسطین، عراق، سوڈان، صومالیہ اور لبنان کے متعلق قراردادوں کو ''واضح فتح'' قرار دیتے ہیں۔ اللہ انہیں تباہ کرے، یہ کس طرح امت کو دھوکہ دیتے ہیں!

اے مسلمانو! امت پر مسلط یہ حکمران امت کے لیے ایک لعنت ہیں۔ جو بار بار امت کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو ہم اس کانفرنس کے موقع پر کوئی بیان جاری نہ کرتے:

﴿لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا لا ِاللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ط قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

''تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے، تو انہوں نے کہا: تاکہ تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کر سکیں اور شائد وہ تقویٰ اختیار کریں'' (الاعراف: 164)

ہم اللہ کے سامنے ہی معذرت کرتے ہیں۔ شائد اس بیان سے سوئے ہوئے جاگ جائیں یا غداروں کو جھنجھوڑا جا سکے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم تو بخوبی علم رکھتے ہو'' (الانفال: 27)

10 ربیع الاول 1428ھ

حزب التحریر

بقیہ صفحہ نمبر 24 سے

اسلام پولیس سٹیٹ کے انداز میں حکومت کرنے کو حرام قرار دیتا ہے

پورا کرنا اسلامی ریاست کے لیے لازم ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست پر واجب ہے کہ اس کے پاس انٹیلی جنس کا دوہرا نظام موجود ہو جس کے ذریعے وہ کفار کی جانب سے اپنے خلاف جاسوسی کی کوششوں کو ناکام بنا سکے۔ بخاری نے سلمة بن الاكوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: ((أتى النبيّ ﷺ عَيْنٌ من المشركين و هو في سفر ، فجلس عند أصحابه يتحدث ، ثم انفتل ، فقال النبي ﷺ اطلبوه و اقتلوه. فقتله ، فنفله ، سلَبَهُ)) ''ایک سفر کے دوران رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ایک جاسوس کو دیکھا جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھا اور ان سے بات چیت کرنے کے بعد نکل کھڑا ہوا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کے پیچھے جاؤ اور اسے قتل کر دو پس میں نے اسے قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس جاسوس کا مال بطور غنیمت عطا کیا''

اور احمد نے فرات بن حیان سے یہ بات روایت کی: أن النبی ﷺ: ((أمَرَ بقتله)) و كان عيناً لأبي سفيان و حليفاً فمرَّ بحلقة الأنصار فقال: إني مسلم، قالوا: يا رسول الله إنه يزعم أنه مسلم فقال : إن منكم رجالاً نكلهم إلى إيمانهم منهم فرات بن حيان)) ''کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے (یعنی فرات کو) قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ جاسوس تھا اور ابوسفیان کا حلیف تھا۔ وہ انصار کے حلقے کے پاس سے گزرا اور کہا میں مسلمان ہوں۔ تو انصار میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''تم میں سے ایسے مرد ہیں جن کے ایمان کا ہم اعتبار کرتے ہیں اور فرات بن حیان ان میں سے ایک ہے''

بخاری نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: ((بعثني رسول الله ﷺ أنا و الزبير و المقداد بن الأسود قال: انطلقوا حتى تأتوا روضة خاخ ، فإن بها ظعينة و معها كتاب ، فخذوه منها فانطلقنا تتعادى بنا خيلنا حتى انتهينا إلى الروضة ، فإذا نحن بالظعينة ، فقلنا: أخرجي الكتاب فقالت: ما معي من كتاب، فقلنا : لتُخرجنَّ الكتاب أو لنلقينّ الثياب ، فأخرجته من عقاصها، فأتينا به رسول الله ﷺ ...)) ''رسول اللہ ﷺ نے مجھے زبیر رضی اللہ عنہ اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا اور کہا: تم روانہ ہو جاؤ یہاں تک کہ تم خاخ کے باغ میں پہنچو۔ وہاں تمہیں اونٹ پر سوار ایک عورت ملے گی جو کہ ایک خط لے کر جا رہی ہے پس تم اس سے وہ خط لے لو۔ ہم تیز رفتاری سے روانہ ہوئے یہاں تک کہ ہم باغ تک جا پہنچے اور ہمیں اونٹ پر سوار عورت نظر آئی۔ ہم نے اس سے کہا: خط نکالو۔ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں۔ ہم نے کہا: نکالو، ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتار کر لے لیں گے۔ تو اس نے اپنے جوڑے میں سے خط نکال کر ہمارے حوالے کر دیا اور ہم اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گئے...''

ان تمام واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں 'پولیس اسٹیٹ' کا کوئی تصور نہیں اور ریاست کے لیے جبر و قوت کے بل پر حکومت کرنا حرام ہے۔ اور جبر و استبداد پر مبنی حکومت مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور یہ احکامِ شریعت کے منافی ہے اور شریعت کے اس اصول کے بھی خلاف ہے: ((لا ضرر و لا ضرار)) ''نہ نقصان پہنچاؤ نہ نقصان اٹھاؤ''

اس طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام ریاست کے لیے انٹیلی جنس کے ایسے ادارے قائم کرنا حرام ہے جو اس کے اپنے باشندوں کی جاسوسی کریں خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، نیز مسلمانوں کو ایذا پہنچانا حرام ہے۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ دشمن کفار کی جاسوسی کرنے، ان کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے اور ان کی طرف سے ریاست کے خلاف جاسوسی کے سدِ باب کے لیے انٹیلی جنس ایجنسیوں کا قیام ریاست پر فرض ہے۔

تبصرہ نگار: جنید احمد

مسئلہ کشمیر اور پاکستانی حکمرانوں کی غداری

پاکستان اور بھارت کے درمیان کمپوزٹ ڈائیلاگ (Composite Dialogue) کے چوتھے مرحلے کے لئے بھارتی سیکرٹری خارجہ شو شنکر شنین پاکستان کے دورے پر آئے۔ ان کے اس دورے میں پاکستان کا مقصد پرویز مشرف کے چار نکاتی منصوبے کے جواب میں بھارت کے ردعمل کو جاننا ہے جبکہ بھارت کے خارجہ سیکرٹری کا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔ یاد رہے کہ اس دورے سے ایک روز قبل نئی دہلی میں کانگریس کا ایک اعلیٰ اجلاس ہوا جسکی صدارت من موہن سنگھ نے کی اور اس میں کانگریس پارٹی کی صدر سونیا گاندھی اور مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیر اعظم غلام نبی آزاد نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں دہشت گردی کے خطرات میں کمی تک فوجی انخلاء کے امکان کو مسترد کر دیا گیا۔ بھارتی سیکرٹری خارجہ نے بھی پاکستان کی حکومت سے یہی مطالبہ کیا کہ وہ بھارت کے خلاف سرگرم دہشت گرد عناصر اور تربیتی کیمپوں کا خاتمہ کرے۔

کیا یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ نہیں کہ وہ کشمیر جسکے مسلمان 60 سال سے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لئے قربانی دے رہے ہیں اور جو ہمارا حق ہے اس سے دستبرداری کے منصوبے کو بھی بھارت کی حکومت ٹھکرا رہی ہے۔ بے حسی اور غلامی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے حکمران ہندوستان کے سامنے ماتھا ٹیکے ہوئے ہیں اور وہ پھر بھی انہیں زدو کوب کر رہا ہے۔ یقیناً ان جیسے حکمرانوں کے بارے میں ہی اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ "قیامت کے دن ہر غدار کے ہاتھ میں ایک علم ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔ جسکا جتنا بڑا علم ہوگا وہ اتنا بڑا غدار ہوگا اور یاد رکھو سب سے بڑی غداری حکمران کی غداری ہے"۔

یوم پاکستان پریڈ

حکومتِ پاکستان نے اس سال 23 مارچ کو یوم پاکستان پریڈ کا انعقاد کیا جسے کچھ عرصہ تک کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند کر دیا گیا تھا۔

اس سال ایک مرتبہ پھر سے ہماری افواج اپنے جدید اسلحے اور ساز و سامان کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ ٹینکوں کے دستے، بکتر بند گاڑیاں، غوری، شاہین اور ہتف میزائل، F-16 طیاروں کے فضائی کرتب اور SSG کے کمانڈوز کی پھرتی اور بہادری کا منظر قابلِ دید تھا۔ ہمارے حکمرانوں کی غداری کی وجہ سے ہماری افواج اب کرتب دکھانے یا پھر اس اُمت کے دشمنوں کی جڑیں مضبوط کرنے اور اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا مقدس لہو بہانے کے کاموں میں ہی مصروف نظر آتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ جن افواج کو کشمیر، فلسطین، عراق، افغانستان اور دیگر مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے برسرپیکار ہونا چاہیئے آج وہ ہمارے غدار حکمرانوں کی بدولت امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی بساط پر شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال ہو رہی ہیں۔ ان مسلم افواج میں آج بھی صلاحیت اور اہلیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایمان اور شہادت کے جذبے کی سرشاری بھی ہے۔ مگر آج انہیں ان غدار حکمرانوں نے بیرکوں تک محدود کر دیا ہے۔ آج ان افواج کو اس خلیفہ کی ضرورت ہے جسکے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ امام ایک ڈھال ہے، اس کے پیچھے سے لڑا جاتا ہے اور اسی سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

عالمی بینک کی رپورٹ

عالمی بینک کے سینئر مشیر جان وال نے ایک انٹرویو میں کہا کہ پاکستان میں عدم مساوات بڑھ رہی ہے اور امیر تیزی سے امیر ترین جبکہ غریب مزید غریب ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ماضی کے مقابلے میں امیر اور غریب کے درمیان یہ خلیج وسیع ہوئی ہے۔ ورلڈ بینک کی طرف سے آنے والے اس تجزیے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو زہر کا پیالہ پلا دے اور جب وہ مرنے لگے تو پلانے والا شخص چلا اُٹھے کہ "دیکھو یہ مر رہا ہے"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج پاکستان کی معیشت جس دلدل میں دھنسی ہوئی ہے اسکی ذمہ داری جہاں ایک طرف ہمارے غیر مخلص حکمرانوں اور دور اندیشی سے عاری پالیسی ساز اداروں پر آتی ہے وہیں پہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا کردار بھی بہت واضح اور اہم ہے۔

یہ ادارے استعماریت اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے وہ ہتھیار ہیں جن کو استعمال کر کے مغرب اِس اُمت کے وسائل کو چوستا ہے اور یہ اُمت غربت و افلاس کی چکی میں پستی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تو بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ غریب اور تنگدستی کا ہونا اس نظام کی کامیابی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ معیشت دولت کی منصفانہ تقسیم اور چند ہاتھوں میں دولت کے سمٹنے کو روکتا ہے۔ خلافت کی 1300 سالہ روشن تاریخ اس امر کی دلیل ہے۔ جب خلیفہ زکوٰۃ کے اہل لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا مگر اُسے ایسے لوگ ہی نہ ملے جو زکوٰۃ کے اہل ہوں۔ یقیناً اسلام کا معاشی نظام ہی اس اُمت میں امیر اور غریب کے درمیان موجود اس خلیج کو پُر کر سکتا ہے۔

امریکہ کی عراق سے باعزت واپسی کے لئے اسلامی امن فوج تشکیل دی جائے۔

مشاہد حسین

سینٹ کی خارجہ امور کمیٹی کے چیئرمین سینٹر مشاہد حسین نے بیان دیا ہے کہ عراق سے امریکہ کی واپسی کے لئے اسلامی امن فوج تیار کی جائے جو پاکستان، انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش اور نائجیریا جیسے ممالک پر مشتمل ہو جن کی سرحدیں عراق سے نہیں ملتیں۔ عراق میں مجاہدین کے خلاف بری طرح ناکام ہو جانے کے بعد امریکہ نے خطے میں اپنے ایجنٹوں کو متحرک کر دیا ہے تاکہ مزاحمت کو کم کرنے کے لئے عراق میں مسلم افواج کو استعمال کیا جائے۔ گذشتہ

دنوں میں اسلام آباد میں ہونے والی ہم خیال ممالک کی کانفرنس میں بھی یہ معاملہ اہم ایجنڈا تھا۔ جب عراق کے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا گیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا گیا تو یہ حکمران یوں تماشا دیکھتے رہے کہ گویا یہ مردہ ہوں بلکہ وہ اس صلیبی حملے کا ہراول دستہ بنے اور اب جبکہ امریکہ کو عراق کے بہادر مجاہدین نے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اور امریکہ کو واضح شکست نظر آ رہی ہے تو یہ حکمران تابعدار غلاموں کی طرح امریکہ کو بچانے کے لئے متحرک ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ایک بار پھر یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ مسلم افواج مسلمانوں کے تحفظ کی بجائے کفار کا تحفظ کرے۔ آج ان حکمرانوں کو ہٹا کر اُس خلافت راشدہ کو قائم کرنے کی ضرورت ہے جو کہ امریکہ کو اس خطے سے نکال باہر کر یگی۔ اور مسلم افواج کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے امریکہ کی کمر توڑ دے گی۔

بھارتی صوبے بہار میں مسلم کش فسادات

گزشتہ دنوں بھارت کے صوبے بہار میں مسلم کش فسادات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندو انتہا پسند تنظیم وشوا ہندو پریشد کے مقامی رہنما نے بہار کا دورہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا جو کہ ان فسادات کی بنیاد بنا۔ بھارت میں ہندو تنظیمیں مسلمانوں کے خلاف ان کاروائیوں میں مسلسل ملوث ہیں۔ اور حکومت ان پر خاموش ہے یا پھر ان کا حصہ بن رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے ماضی میں گجرات میں دیکھا کہ جہاں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کروایا گیا۔ اور بھارتی حکومت اس میں ملوث رہی۔ بھارت میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ان کھلے اعترافات کے برعکس ہمیں نظر آتا ہے کہ ہمارے حکمران پاکستان میں ہندو مذہب کو پروان چڑھانے کے درپے ہیں۔ جو کہ نصاب میں ہندو مذہب کی تعلیم کو شامل کرنے اور پنجاب کے بیشتر علاقوں میں مندروں کی تعمیر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مزید ان انڈین چینلز کو کھلی آزادی ہے جن کے ہر ڈرامے اور پروگرام میں ہندو مذہب کی عبادات کو بار بار دکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان تمام مسلم کش فسادات پر حکومتِ پاکستان خاموش نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں گجرات کے واقعے پر بھی نظر آیا جب مشرف نے اسے بھارت کا اندرونی معاملہ قرار دیا جبکہ بابری مسجد کی شہادت میں ملوث ایل کے ایڈوانی کا بھی استقبال کیا گیا۔ مشرف اور موجودہ حکومت ہمارے اسلامی تشخص کو ختم کرنے اور برصغیر میں ہندو مشرکین کی بالادستی کو قائم کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ ہمیں اُس اسلامی خلافت کی ضرورت ہے جو کہ اس خطے کے مسلمانوں کی جان مال، عزت، عقیدے اور سرزمین کا تحفظ کرے گی۔ اور ہندو مشرکین کے غلیظ اور ناپاک منصوبوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو برصغیر پر غالب کرے گی۔

عدلیہ کا بحران

صدارتی ریفرنس کے ذریعے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کو ''غیر فعال'' بنانے کی حکومتی کاروائی نے ایک دفعہ پھر سرمایہ درانہ نظام کے دلفریب نعروں، عوام کی حکمرانی، عدلیہ کی آزادی اور آزادی رائے کی حقیقت کا پول کھول دیا ہے۔ ماضی میں برصغیر کی تاریخ میں سب سے بھاری مینڈیٹ سے جیتنے والے وزیراعظم نواز شریف کی طرف سے اس وقت کے چیف جسٹس سجاد علی کی برطرفی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جمہوری حکومت ہو یا آمریت سرمایہ درانہ نظام میں انصاف اور احتساب ہمیشہ حکمران طبقہ کی تشریح کے مرہونِ منت ہیں۔ اور جب بھی اس طبقہ کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوا ہے، تو قانون اور آئین کی اپنی مرضی کی تشریح کر کے حکمران طبقے نے ان مفادات کی حفاظت کی ہے، یہ روایت جمہوری نظام کا خاصہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نظامِ حکومت میں حکمران صرف قرآن وسنت سے اخذ کئے گئے قوانین کو نافذ کرتا ہے اور حکمران کی اطاعت کی بنیاد بھی شریعت کے نفاذ کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر خلیفہ اسلام کے احکامات سے انحراف کرے اور اپنی مرضی کرنے کی کوشش کرے تو عوام پر اسکی اطاعت کرنا لازم نہیں رہتا۔ بلکہ اس کو ہٹانا فرض ہو جاتا ہے۔

حکومتِ پاکستان کی معاشی پالیسیاں

حکومتِ پاکستان نے تیل اور گیس کی قیمت میں اضافے کے نتیجے میں موجودہ مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں 34 ارب روپے کے فنڈز اکھٹے کئے جبکہ اس سال کا ٹارگٹ 18 ارب روپے تھا۔ ایک طرف جبکہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں مسلسل کمی ہو رہی ہے حکومت پاکستان تیل اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ کر کے منافع کما رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں قیمتوں میں ہوشربا اضافے کے باعث غریب عوام کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر ہر اخبار کی زینت تھی کہ ایک نوجوان نے بیمار ماں کے علاج کروانے کے لئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو مار کر خودکشی کر لی۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کا خلیفہ خود کو بھوکے کتے کی موت کا ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ اور ایک آج کا دور ہے جب حکمران اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں اور عوام مر رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

امریکی مطالبے

امریکی سینٹ کے ممبران نے بش انتظامیہ پر زور دیا ہے کہ وہ پاکستان کے اندر مشتبہ القاعدہ اور طالبان کے ٹھکانوں پر حملہ کرے۔ تقریباً چھ سال پہلے امریکی صلیبی جنگ کا ہراول دستہ بننے کا اعلان کرتے وقت مشرف نے پاکستان کے عوام کو یقین دہانی کرائی تھی کہ افغان مسلمانوں کو ذبح خانے میں دھکیلنے کے عوض پاکستان محفوظ رہے گا۔ آج اسی ہزار سے زائد فوج پاک افغان بارڈر پر لگانے، سینکڑوں مسلمانوں کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنے اور اپنی ہی عوام کے خلاف وزیرستان اور قبائلی علاقہ جات میں فوجی کاروائی کرنے کے باوجود امریکہ پاکستان سے ناخوش ہے۔ اور اس سے مزید اقدامات کا تقاضا کر رہا ہے اور پاکستانی علاقوں میں حملے کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جو قوم دفاع کے عوض اپنی سالمیت بیچ دے، اسے دفاع اور سالمیت دونوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ امریکہ کی طرف سے پاکستان پر حملے کا عندیہ دینے کے باوجود پاکستانی حکمران امریکی غلامی کا طوق اتار پھینکنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

یکم اپریل 2007 کو حزب التحریر کے زیر اہتمام کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور میں فرضیتِ خلافت سیمینارز منعقد کئے گئے۔ مندرجہ بالا تصاویر کراچی کے سیمینار کی ہیں جہاں پر سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔

یہ تصاویر آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں حزب التحریر کے زیر اہتمام ہونے والی خلافت کانفرنس کی ہیں۔ جو 2007 کے اوائل میں منعقد ہوئی۔ حکومت کی مخالفت کے باوجود ہونے والی اس کانفرنس میں مسلمانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

28 فروری 2007 کو ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش میں حزب التحریر نے بنگلہ دیش کی معیشت کو استعمار کے ہاتھوں گروی رکھوانے کے اہم کردار ڈاکٹر یونس کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا جس پر حکومت کی طرف سے حزب التحریر کے کئی ارکان کو گرفتار کر لیا گیا جنہیں تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد 18 اپریل کو رہا کیا گیا

میگزین
خلافت
علیٰ منہاج نبوت
جمادی الاول ،جمادی الثانی
1428ھ 2007ء

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا ، اے عقاب

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لئے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لئے

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا ، اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

کامیابی کی ہوا کرتی ہے ناکامی دلیل
رنج آتے ہیں تجھے راحت دلانے کے لئے

نیم جاں ہے کس لئے حالِ خلافت دیکھ کر
ڈھونڈ لے کوئی دوا ، اِس کو بچانے کے لئے

چین سے رہنے نہ دے ان کو ، نہ خود آرام کر
مستعد ہیں جو خلافت کو مٹانے کے لئے

آتشِ نمرود گر بھڑکی ہے کچھ پروا نہیں
وقت ہے شانِ براہیمی دکھانے کے لئے

یہ نظم 1919ء میں لاہور سے شائع ہونے والے اُس وقت کے مشہور اخبار 'روزنامہ آفتاب' میں شائع ہوئی، اس نظم کے شاعر جناب سید صادق حسین شاہ تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب خلافت کو ختم کرنے کے لیے برطانیہ اور دوسری استعماری ریاستیں پر تول رہی تھیں۔ اس نظم سے خلافت سے متعلق مسلمانانِ برصغیر کی فکرمندی صاف عیاں ہے